محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۴۰

سازشی مہربان

اشتیاق احمد

نام ناول ــــــ سازشی مہربان

بار اول ــــــ یکم مارچ ۱۹۸۶ء

طابع ــــــ اشتیاق احمد

مطبع ــــــ زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

طباعت سرورق ــــــ سپیریم پرنٹرز، لاہور

سرورق ــــــ محمد جاوید چغتائی، لاہور

کتابت ــــــ محمد سعید نامدار، وائیونڈ کلاں

قیمت ــــــ چھے روپے

سالانہ قیمت ــــــ تین سو روپے

اشتیاق پبلیکیشنز

راجپوت مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک گاؤں والے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی ۔ تو اس نے ایک گوہ (جنگل کا ایک جانور) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چھوڑ دی اور کہا ، میں تب تک ایمان نہ لاؤں گا جب تک یہ گوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ، بتلا میں کون ہوں ؟ گوہ نے نہایت بلیغ عربی زبان میں جس کو ساری مجلس سمجھتی تھی ، کہا ، اے رب العالمین کے سچے رسول ، میں حاضر ہوں اور آپ کی اطاعت کرتی ہوں ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو کس کی عبادت کرتی ہے ؟ گوہ نے جواب دیا کہ اس ذات مقدس کی کہ آسمان میں اس کا عرش عظیم ہے اور زمین پر اس کا قبضہ و سلطنت ہے اور دریا میں اس کا بنایا ہوا راستہ ہے اور جنت میں اس کی رحمت ہے اور دوزخ میں اس کا عذاب ہے ۔

آپ ﷺ نے فرمایا، میں کون ہوں؟ گوہ نے
جواب دیا کہ آپ ﷺ پروردگار عالم کے سچے
رسول ہیں اور نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں ـــــ

(بیہقی ، ابو نعیم ، ابن عساکر)

تشریح

افسوس ، جنگل کے وحشی جانور آپ ﷺ کے
آخر النبیین ہونے پر ایمان لائے ہیں ، مگر اسلام کے
دعوے دار قادیانیوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

دو باتیں

السلام علیکم ! مہربان ساتھی

اس وقت آپ [illegible] پڑھنے والے ہیں ،
اس سے پہلے اگر میں یہ کہوں کہ ہمارے بھی ہیں
مہربان کیسے کیسے ، تو یہ کچھ بے جا نہیں ہوگا۔ میرے
ایک مہربان نے مجھے خط لکھا ، میری بہن نے خودکشی
کر لی ہے۔ ہم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے
ہیں ، ایسے میں مالی پریشانی الگ ہے ۔ کچھ رقم
ارسال کر دیں ، میں نے کچھ پیسے بھجوا دیے ۔ اب
ان کا ایک اور خط ملا کہ پیسے مل گئے ہیں ، بہن
کی خودکشی والی بات میں نے جھوٹ لکھی تھی ،
آپ کو آزمانا چاہتا تھا۔ آپ آزمائش میں پورے اترے
اور اب ۔ اب کوئی ان مہربان سے پوچھے کہ بھئی
آزمانے کے لیے جو رقم منگوائی تھی ، وہ اب تو واپس
کرنی چاہیے تھی ۔

اس قسم کے ایک اور مہربان نے خط لکھا ۔ مجھے

کہ پیسوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ نے ارسال کر دیے تو میں خیال کروں گا کہ آپ جیسے نظر آتے ہیں، ویسے ہیں بھی۔ اور اگر نہ ارسال کیے تو کہوں گا کہ! ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ میں نے ڈر کے مارے پیسے بھجوا دیے۔ جواب ملا۔ یہ تو صرف آپ کو آزمایا تھا، ہمیں پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے بھی یہ تو لکھ دیا، لیکن رقم واپس نہیں کی۔

اس قسم کے مہربانوں سے آئے دن واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اب تو میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا ہے کہ ان آزمائشوں میں تو برابر فیل ہوتے رہنا چاہیے، آپ کا کیا خیال ہے۔ ہیں جی—

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

● یہ وقت نماز کا تو نہیں —
● آپ کو کسی کا کوئی کام تو نہیں کرنا —
● کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں —
● آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا —
● آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں۔ پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ!

اشتیاق احمد

ترتیب

نصف میدان مار لیا ہم نے

"اُف اللہ! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے" فاروق نے پریشان کن آواز میں کہا۔

"کیا ہو گیا ہے۔ ہمیں تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا" فرزانہ نے اُسے گھورا۔

"اور کیا اچھے بھلے تو ہو" محمود نے منہ بنایا۔

"بے شک میں اچھا بھلا ہوں، لیکن میری روح بے قرار ہے" فاروق منمنایا۔

"ارے تو اسے سمجھاؤ نا، بے قرار رہنا اچھی بات تو نہیں" فرزانہ مسکرائی۔

"کیا کہا۔ روح کو سمجھاؤں، وہ تو اُلٹا مجھے سمجھا کر رکھ دے گی" فاروق نے جل بھن کر کہا۔

"کیا سمجھا کر رکھ دے گی؟" فرزانہ مذاق اُڑانے والے انداز میں بولی۔

"الجھا۔ اور کیا" فاروق نے فوراً جواب دیا۔

"بھئی وضاحت کرو۔ تم کیا محسوس کر رہے ہو؟"

"میری روح۔ ٹھہرو۔ یوں کام نہیں چلے گا" اس نے پُراسرار انداز میں کہا اور اٹھ کر فون کے پاس چلا گیا، دوسرے ہی لمحے وہ فون پر کسی کے نمبر ڈائل کر رہا تھا:

"کسے فون کر رہے ہو۔ کچھ بتاؤ بھی تو" محمود جھلا اٹھا۔

"ایک منٹ ٹھہرو" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا، اسی وقت سلسلہ مل گیا اور وہ جلدی سے بولا:

"ہیلو انکل۔ میری روح گھر سے نکل جانے کے لیے بُری طرح بے تاب ہے۔ یوں کہ لیں، پَر تول رہی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں فاروق۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یکایک۔ یہ گھر مجھے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا ہے۔ کوئی خفیہ طاقت مجھے بار بار کہ رہی ہے کہ یہاں سے نکل چلو۔ نکل چلو۔"

"تو پھر تمہیں گھر سے نکل جانا چاہیے۔ فوراً نکل کر میرے ہاں آ جاؤ" خان رحمان ہنس کر بولے۔

"آپ ہنس رہے ہیں انکل اور میں حد درجے سنجیدہ ہوں" فاروق نے مُردہ آواز میں کہا۔

"اوہو اچھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا، تم حد درجے سنجیدہ ہو۔

خیر۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہ کہ فوراً کسی جگہ کی سیر کا پروگرام بنائیے۔ اور مجھے لے کر نکل چلیے۔ یہ میرے دل کی آواز ہے" اس نے کہا۔

"اور کیا تم پوری طرح سنجیدہ ہو؟"

"جی ہاں۔ بالکل۔ اتنا سنجیدہ تو شاید میں زندگی میں پہلی بار ہوں۔"

"اچھا تو پھر میں آ رہا ہوں۔"

"آتے ہوئے پروفیسر انکل کو بھی فون کرتے آئیے انکل۔ ورنہ انہیں شکایت ہو گی۔"

"ہوں اچھا۔ فکر نہ کرو۔"

اور فاروق نے ریسیور رکھ دیا۔ محمود اور فرزانہ اسے بُری طرح گھور رہے تھے:

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟"

"نہیں۔ میں نے تو یہ بات بالکل محسوس نہیں کی۔"

"بیٹھے بٹھائے سیر کا پروگرام بنا رہے ہو۔ یاد نہیں۔ چند دن تک ہمارے ٹسٹ شروع ہو رہے ہیں۔"

"اچھی طرح یاد ہے، لیکن میری روح کی بے قراری ہے کہ ہر لمحے بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے" فاروق [illegible] بے چارگی کے عالم میں بولا۔

"اللہ تمھاری روح پر رحم کرے۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"ابا جان ایسے میں کہیں بھی جانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ انھیں معلوم ہے، ہمارے ٹسٹ شروع ہونے والے ہیں۔"

"اسی لیے تو میں نے انکل کو بلوایا ہے۔" وہ مسکرایا۔

"کیا مطلب؟" دونوں چونکے۔

"میری بات ماننے سے ابا جان فوراً انکار کر دیتے، لیکن انکل خان رحمان اور پروفیسر انکل کی بات ٹالنا ان کے لیے آسان نہیں ہوگا۔"

"گویا تم انھیں الجھن میں مبتلا کرو گے۔"

"نہیں۔ الجھن کیسی۔ الجھن دور کرنے کے لیے تو سیر کا پروگرام بنایا جا رہا ہے۔" اس نے فوراً کہا۔

"اچھا بابا۔ تمھاری تم جانو۔"

"صرف میں کیوں جانوں گا۔ تمھیں بھی جانا ہو گا۔"

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فاروق نے جلدی سے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے پروفیسر داؤد کہہ رہے تھے:

"ہیلو۔ پروفیسر داؤد بول رہا ہوں۔ فاروق۔ یہ تم ہو نا۔"

"جی ہاں! اللہ کی مہربانی سے میں ہی ہوں۔"

"شکر ہے اللہ کا۔" انھوں نے پرسکون آواز میں کہا۔

"کیوں انکل۔ خیر تو ہے۔ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں بھئی۔ بس ایک عجیب سی بات تھی۔"

"کچھ بتایئے تو انکل۔ ورنہ ہم الجھن میں مبتلا رہیں گے۔"

"تمھارے انکل خان رحمان نے تھوڑی دیر پہلے فون کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں گھر سے کہیں نہ جاؤں۔ وہ پہنچ رہے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ فاروق بہت پریشان ہے۔ میں نے یہ سن کر کہا کہ اچھا، آ جاؤ۔" یہ کہہ کر پروفیسر داؤد خاموش ہو گئے۔

"تب پھر۔ کیا ہوا۔ کیا وہ اب تک آپ کے پاس نہیں پہنچے۔"

"انکل اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں، ہو سکتا ہے، ان کی کار کا ٹائر پنکچر ہو گیا ہو۔ یا کسی سڑک پر ٹریفک جام ہو گیا ہو، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ٹریفک جام ہونا آج کل عام بات ہے۔"

"مشکل تو یہی ہے کہ ان میں سے کوئی بات نہیں ہے۔" پروفیسر داؤد نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"جی کیا مطلب۔" فاروق چونکا۔

"نہ تو ٹریفک جام ہوا ہے اور نہ ٹائر پنکچر۔" وہ بولے۔

"جی۔ چلیے یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں جب کہ وہ ابھی آپ تک نہیں پہنچے۔"

"میں نے یہ کب کہا کہ وہ میرے پاس نہیں پہنچے" وہ حیران ہو کر بولے۔

"آپ کی باتوں سے تو صاف یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ تو کیا انکل خان رحمان آپ تک پہنچ چکے ہیں" فاروق نے قریباً چیخ کر کہا۔

"آہستہ آواز میں بات کرو بھئی۔ میرا کان جھنجنا اٹھا ہے، ہاں۔ خان رحمان میرے پاس پہنچ چکے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ نہیں پہنچے۔"

"یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔"

"بہتر ہوگا کہ تم لوگ فوری طور پر یہاں آجاؤ۔" انھوں نے خوف زدہ آواز میں کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

فاروق نے ریسیور کو تیز نظروں سے گھورا، جیسے سارا قصور اسی کا ہو، پھر اسے پٹخ کر ان کی طرف مڑا:

"کوئی عجیب بات ہو گئی ہے، ہمیں فوری طور پر تجربہ گاہ پہنچنا ہے۔ آؤ چلیں۔"

"کچھ بتاؤ بھی تو۔" محمود بے چین ہو گیا۔

"انکل خان رحمان نے میرا فون سن کر پروفیسر انکل کو فون کیا تھا کہ وہ ان کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ وہ ان کے پاس پہنچ گئے، لیکن شاید کسی عجیب حالت میں پہنچے ہیں، کیوں کہ پروفیسر انکل نے یہ جملہ ادا کیا ہے۔ وہ پہنچ چکے ہیں، لیکن میرا خیال ہے، نہیں پہنچے۔"

"اوہ۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"انھوں نے اس بات کا جواب نہیں دیا۔ ریسیور رکھ دیا۔ ہاں ہمیں فوری طور پر پہنچنے کے لیے ضرور کہا ہے۔"

"تو پھر چلو۔ دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

انھوں نے اپنی والدہ کو مختصر طور پر بات بتائی اور موٹر سائیکلوں پر گھر سے روانہ ہوئے۔ بیس منٹ بعد وہ پروفیسر داؤد کے رہائشی حصے میں داخل ہو رہے تھے۔ دروازہ انھیں کھلا ملا تھا، باہر خان رحمان کی کار بھی کھڑی نظر آئی تھی۔ انھوں نے دستک دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اسی وقت شائستہ پروفیسر داؤد کے کمرے سے نکلتی نظر آئی۔ انھیں دیکھ کر خشکی اور پھر ست آواز میں بولی:

"خیر تو ہے۔"

"ادھر ہی آجاؤ۔ انکل یہیں ہیں۔"

وہ انھیں لے کر اندر داخل ہوئی۔ اندر ایک مسہری پر خان رحمان بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے دوسری مسہری پر پروفیسر داؤد بیٹھے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ قدموں کی آواز سنتے ہی پروفیسر داؤد ان کی طرف مڑے، لیکن خان رحمان کے جسم میں ذرا سی بھی حرکت نہیں ہوئی۔ انھیں

یوں لگا جیسے خان رحمان کو ان کی آمد کا پتا ہی نہ چلا ہو۔ ان پر حیرت کی بجلی گری، پھر محمود نے سنبھلتے ہوئے تیز آواز میں کہا:

"السلام علیکم انکل۔"

"و ع۔ و ع۔ علیکم السلام۔" پروفیسر داؤد نے بڑی مشکل سے کہا، یوں لگا جیسے الفاظ ان کے حلق میں اٹک گئے ہوں۔ لیکن خان رحمان کے کان پر اب تک جوں نہیں رینگی تھی۔

*

انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ انسپکٹر جمشید نے ریسیور اٹھایا تو آئی جی کی آواز سنائی دی:

"جمشید۔ ذرا جلدی سے میرے پاس آؤ۔"

"او کے سر!" انھوں نے کہا اور ریسیور رکھتے ہی کمرے سے نکل گئے۔ آدھ منٹ بعد ہی وہ آئی جی صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے، وہاں ڈی آئی جی بھی موجود تھے۔ اور ان کی صورتوں پر فکر کے گہرے بادل تیر رہے تھے۔

"خیریت تو ہے جناب؟"

"خیریت معلوم نہیں ہوتی۔" آئی جی بولے۔

"جی۔ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آج صدر صاحب کی طرف سے ان کے گھر والوں کو فون نہیں ملا۔"

"میں سمجھا نہیں جناب۔" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ صدر مملکت مہینے میں صرف تین دن کے لیے مکمل طور پر آرام کرتے ہیں، باقی ستائیس یا اٹھائیس دن مسلسل کام کرتے ہیں، تین دن تک آرام کرنے کے لیے انھوں نے ایک خفیہ جگہ بنا رکھی ہے۔ اس جگہ سے ان کے اور ان کے ڈرائیور کے علاوہ کوئی واقف نہیں۔ گھر تک کا کوئی فرد نہیں جانتا کہ وہ جگہ کہاں ہے اور یہ اس لیے کہ کم از کم مہینے میں تین دن تو وہ آرام سے رہ لیں۔ کل وہ اس خفیہ جگہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ ساتھ ان کا ڈرائیور تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد انھوں نے فون کر دیا تھا کہ وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکے ہیں۔ اور گھر کے افراد مطمئن ہو گئے۔ خیریت کی خبر کے طور پر وہ نو بجے اپنے گھر فون کیا کرتے تھے۔ دوسرے دن ان کا فون نہیں ملا۔ گھر کے افراد کو پریشانی شروع ہو گئی۔ تمام دن ان کے فون کا انتظار کیا گیا، لیکن فون تیسرے دن بھی فون نہیں آیا۔ اب انھوں نے ہم سے رابطہ قائم کیا۔"

ہے۔ تم ہی بتاؤ، ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس ٹھکانے کے بارے
میں کسی کو بھی اطلاع نہیں۔"
"واقعی۔ بہت پریشانی کی بات ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔
"نہیں ان کا فون نمبر بھی معلوم نہیں ہے۔" ڈی آئی جی
بولے۔
"ہوں۔ یہاں موجود لوگوں میں سے کم از کم ایک آدمی کو
تو ان کے ٹھکانے کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔"
"یہی تو مصیبت ہے۔" آئی جی بولے۔
"کسی کو کوئی اندازہ بھی نہیں کہ وہ کس طرف جاتے ہیں؟"
انسپکٹر جمشید نے کچھ سوچ کر پوچھا۔
"سمت کا اندازہ تو خیر ہے۔"
"تو پھر ہم اس سمت میں نکل جاتے ہیں۔" انھوں نے
اُٹھتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے جمشید۔ جو تم مناسب سمجھو، کرو۔ وہ شمال مغرب
کی طرف جایا کرتے تھے۔"
"میں ابھی روانہ ہوتا ہوں۔" انھوں نے کہا اور کمرے سے
نکل آئے۔ اپنے کمرے سے انھوں نے اکرام کو ساتھ لیا اور نکل
کھڑے ہوئے، کیوں کہ محمود، فاروق اور فرزانہ کو ساتھ لینے کا
وقت نہیں تھا۔

"خیر تو ہے سر؟" اکرام نے پریشان آواز میں پوچھا۔
"خیر نظر نہیں آتی اکرام۔ صدرِ مملکت آرام کی غرض سے اپنے
کسی خاص ٹھکانے پر گئے ہوئے تھے، اس ٹھکانے کے بارے
میں کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ کہاں ہے، لیکن ان کی طرف سے
فون موصول نہیں ہو رہا، جب کہ وہ روزانہ صبح نو بجے فون
کرنے کے عادی ہیں۔"
"اوہ!" اکرام دھک سے رہ گیا۔
"ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ جب وہ اس خاص ٹھکانے کی
طرف جاتے ہیں تو ان کا رُخ شمال مغرب کی طرف ہوتا ہے۔
لہٰذا ہم بھی شمال مغرب کی طرف نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ہم
کر ہی کیا سکتے ہیں۔"
"لیکن سر۔ شمال مغرب کی طرف چل کر بھلا ہم انھیں کس
طرح تلاش کر سکیں گے؟" اکرام نے حیران ہو کر کہا۔
"پتا نہیں اکرام۔ میں خود بہت پریشانی محسوس کر رہا ہوں۔
اور اب سوچتا ہوں۔ میں نے غلطی کی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ
کو ساتھ لے لینا چاہیے تھا۔"
"تو چل کر انھیں لے آتے ہیں۔"
"نہیں۔ اس طرح وقت ضائع ہوگا۔"
"بہت بہتر۔ چلیے، رہیے پھر۔"

اُن کا سفر جاری رہا۔ شمال مغربی سڑک پر وہ سیدھے ہی چلتے رہے۔ اِدھر اُدھر مُڑنے کی کوشش نہیں کی۔ حالاں کہ جانتے تھے۔ یہ بالکل فضول کوشش ہے۔ آخر وہ شہری حدود سے باہر نکل گئے۔ اچانک انسپکٹر جمشید نے بریک لگا دیے۔

"کیا ہوا سر۔ کیا کوئی عمارت نظر آگئی ہے؟"

"نہیں اکرام۔ مجھے ایک خیال سوجھا ہے۔ اور وہ یہ کہ پہلے ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ صدر صاحب نے تین دن گزارنے کے لیے کون سی جگہ پسند کی ہو گی۔ بلکہ یہ کہ کس قسم کی جگہ پسند کی ہو گی۔ اس کے لیے ہمیں ان کی پسند اور ناپسند کا جائزہ لینا ہوگا۔" انھوں نے سوچ میں گم لہجے میں کہا۔

"بہت خوب سر۔ بہت اچھا خیال ہے۔"

"اور اکرام۔ میں جانتا ہوں۔ صدر صاحب کو کسی جھیل کے کنارے ٹہلنا بہت پسند ہے۔ انھیں دریا اور سمندر کے کناروں کی بجائے جھیل کا کنارا پسند ہے۔ اکثر میں نے ان کے منہ سے سنا ہے۔ جو سکون جھیل کی سطح پر ہوتا ہے۔ وہ دریا اور سمندر کے پانی کو کہاں نصیب۔ اکرام ان اطراف میں کوئی جھیل ہونی چاہیے۔"

"میرے علم میں تو نہیں ہے، لیکن ہم کسی سے معلوم کر ہی سکتے ہیں۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔" انھوں نے کہا اور جیپ پھر چلا دی۔ آخر چند کچے گھر نظر آ گئے۔ انھوں نے جیپ کا رُخ اسی سمت میں کر دیا۔ نزدیک پہنچ کر وہ نیچے اُترے اور ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔ جلد ہی ایک ادھیڑ عمر دیہاتی کی صورت نظر آئی:

"کیوں بھئی۔ اس طرف کوئی جھیل ہے؟"

"جھیل۔ اوہ ہاں جناب۔ بارشوں کا پانی ہر سال اس میں جمع ہو جاتا ہے۔ بہت گہری جھیل ہے اور بہت خوب صورت بھی۔ کیا آپ جھیل کی سیر کریں گے؟"

"نہیں۔ وہ کس طرف ہے؟"

"دائیں طرف والی پگ ڈنڈی پر مڑ جائیے گا۔ کافی چوڑی ہے۔ آپ کی جیپ آسانی سے جا سکے گی، کوئی دس کلو میٹر دور جا کر آپ کو جھیل نظر آ جائے گی۔ اس کے کنارے ایک خوب صورت اور چھوٹا سا بنگلہ بھی ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" انھوں نے پرجوش انداز میں کہا اور جیپ میں بیٹھ گئے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اس خاص ٹھکانے پر پہنچنے والے ہیں۔ اکرام، جانے کیا بات ہے، میرا دل دھک دھک کر رہا ہے۔"

"آپ کا دل — وہ دھک دھک کر رہا ہے — اللہ اپنا رحم فرمائے۔" اکرام نے پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

"جی — آخر میں بھی انسان ہوں۔" وہ مسکرائے۔

اب وہ پگ ڈنڈی پر چل رہے تھے — آخر دس کلو میٹر کے قریب چلنے کے بعد انھیں جھیل نظر آ گئی — جھیل بہت بڑی اور پُر سکون تھی — اس کے چاروں طرف ناریل کے درخت اُگے ہوئے تھے — یوں لگتا تھا جیسے جھیل کا پہرہ دے رہے ہوں — ایک طرف ایک چھوٹا سا سفید رنگ کا بنگلہ نظر آیا — ان کے قدم بے اختیار بنگلے کی طرف اُٹھنے لگے:

"اکرام — میرا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں نے شاید ہی کبھی آپ کا خیال غلط ہوتے دیکھا ہے۔"

وہ بنگلے کے دروازے پر پہنچ گئے — دروازہ بند تھا اور اس کے باہر کوئی کار نہیں تھی — جب کہ صدر صاحب اپنی کار پر یہاں آئے تھے — انھوں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دباؤ ڈالا — دروازہ اندر سے بند تھا — اب انھوں نے دستک دی — آدھ منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی کی صورت دکھائی دی:

"جی فرمائیے۔" اس نے خوش گوار آواز میں کہا۔

"کک — کیا یہ آپ کا بنگلہ ہے؟"

"تو آپ کے خیال میں اور کس کا ہو سکتا ہے؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"شکریہ — ہمیں آپ کے مہمان سے ملنا ہے۔"

"جی کیا مطلب — مہمان — ارے صاحب — مدت ہوئی — میں نے کسی مہمان کا منہ نہیں دیکھا — یہاں کون آئے گا مجھ سے ملنے — مجھ سے تو سارے گھر والوں نے رشتہ توڑ لیا ہے — اور زندگی کے دن یہاں پورے کر رہا ہوں۔"

"اوہ! یہ جان کر بہت افسوس ہوا، تو بنگلے میں آپ کے سوا کوئی نہیں رہتا؟"

"نہیں — میں ساری دنیا سے الگ تھلگ رہتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ — ہم نے آپ کو زحمت دی۔"

"بات کیا ہے — میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"ہمارے بھی ایک مہربان ہیں — بالکل آپ کی طرح تنہائی پسند، انھوں نے بھی اپنے لیے ایک الگ تھلگ جگہ بنائی ہوئی ہے، لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ وہ جگہ کہاں ہے — دو دن سے ان کی خیریت کی اطلاع نہیں ملی، اس لیے تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔"

"اوہ اچھا۔"

وہ واپس پلٹ گئے۔ ادھیڑ عمر آدمی نے بنگلے کا دروازہ بند کر لیا۔ وہ مایوسانہ انداز میں واپس روانہ ہوئے۔ سڑک کے کنارے پہنچے تو وہ آدمی نظر آیا جس نے جھیل کے بارے میں بتایا تھا:

"کیوں جناب جھیل پسند نہیں آئی؟" اس نے بلند آواز میں کہا۔

"جھیل تو بہت خوب صورت ہے۔ اس کے کنارے رہنے والے صاحب ہی پسند نہیں آئے۔" انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

"کیوں کیوں۔ ان جیسا ملنسار آدمی تو شاید ہی کوئی ہو۔" دیہاتی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

"ان کے ڈرائیور صاحب مرغیاں تو ہم سے ہی خریدتے ہیں نا۔ کبھی کبھار خود ہمیں بھی مرغیاں وہاں پہنچانا پڑتی ہیں۔"

"وہ روزانہ مرغیوں کا کیا کرتے ہیں؟"

"روزانہ نہیں جناب۔ مہینے میں صرف تین دن۔"

"مہینے میں صرف تین دن۔ کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونک کر بولے۔

"وہ اس بنگلے میں مہینے میں صرف تین دن گزارتے ہیں۔ باقی دن بنگلہ خالی پڑا رہتا ہے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر انسپکٹر جمشید جلدی سے دیہاتی کی طرف مڑے:

"ان کا حلیہ کیا ہے؟"

"گول مٹول چہرہ، سرخ و سفید رنگ۔ اور لمبا قد۔"

"ن۔ نہیں۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا، کیوں کہ یہ حلیہ صدر صاحب کا تھا۔

"جی ہاں جناب۔ بالکل یہی حلیہ ہے۔ وہ مرغیاں ہم سے خریدتے ہیں۔ پھر ان کا ڈرائیور مرغیاں خود پکاتا ہے اور بچ جانے والا کھانا تینوں دن ہمیں ملتا رہتا ہے۔ اُف۔ ان کا ڈرائیور کتنا بہترین پکاتا ہے۔ میں بتا نہیں سکتا۔"

"ڈرائیور سالن پکاتا ہے؟" انسپکٹر جمشید نے حیرت زدہ انداز میں کہا، یہ بات ان کے لیے بالکل نئی تھی۔

"جی ہاں!"

"آؤ اکرام۔ ہمیں ایک بار پھر بنگلے کی طرف جانا ہوگا۔ ہم غلط جگہ نہیں پہنچے تھے۔ ذرا آپ بھی ہمارے ساتھ چلیے۔" انھوں نے دیہاتی سے کہا۔

وہ واپس مڑے۔ دیہاتی حیرت زدہ انداز میں جیپ میں بیٹھ گیا۔ اب ان پر جوش کا ایک عالم طاری ہو چکا تھا۔ جلد ہی وہ بنگلے کے سامنے پہنچ گئے۔ جیپ سے اُتر کر انسپکٹر جمشید نے

یہ کہتے ہی اس نے انسپکٹر جمشید کے پستول والے ہاتھ پر ایک ہاتھ مارا اور چھلانگ لگا دی۔ وہ جیپ کے پاس جا کر گرا۔ دوسرے ہی لمحے وہ جیپ میں سوار ہو چکا تھا۔ انسپکٹر جمشید اور اکرام بلا کی رفتار سے اس کی طرف جھپٹے۔ اس وقت تک جیپ سٹارٹ ہو چکی تھی، لیکن رفتار میں نہیں آئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اسے موڑ بھی کاٹنا تھا۔ لہٰذا دونوں دائیں بائیں سے جیپ میں سوار ہو گئے۔ انسپکٹر جمشید کا ایک زبردست مکا اس کی کن پٹی پر لگا۔ اس نے جیپ کا سٹیرنگ پھر بھی نہ چھوڑا۔ جیپ بے قابو ہو کر سیدھی جھیل کی طرف گئی۔ اسی وقت انھوں نے اس کی گردن پر دوسرا مکا مارا۔ اس نے سٹیرنگ پھر بھی نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ جیپ جھیل میں گرنے لگی۔

"ارے ارے۔ روکو۔ دماغ تو نہیں چل گیا۔" اکرام نے چلّا کر کہا۔

لیکن شاید اس پر دیوانگی طاری ہو چکی تھی۔ اس نے جیپ کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ وہ پانی میں داخل ہو گئی۔

اب تو وہ گھبرا گئے۔ جیپ اب ڈوبنے لگی تھی۔

"اکرام! ہم اسے ڈوبنے نہیں دیں گے۔ اس کا ارادہ خودکشی

دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھلا اور اسی آدمی کی صورت دکھائی دی:

"میرے ہاتھ میں پستول ہے۔ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔" وہ سرد آواز میں بولے۔

"کک۔ کیا مطلب؟" وہ اچھل پڑا۔ آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

"ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ ہمیں بنگلے کی تلاشی لینی ہے۔"

"بات کیا ہے؟"

"بات تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ یہ بنگلہ تمھارا نہیں ہے۔ جن کا ہے، ہم ان ہی کی تلاش میں ہیں، لہٰذا تمھیں یہ بھی بتانا ہو گا کہ وہ کہاں ہیں؟"

"پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"ادھر دیکھو۔ جیپ میں ایک دیہاتی بھی موجود ہے۔ یہ اس بنگلے کے مالک اور ان کے ڈرائیور کو بہت اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اب تم کیا کہتے ہو؟"

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا، آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

"دیکھو دوست۔ میں نے تم سے کہا ہے، ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ اب میں گولی چلا دوں گا تو پھر احتجاج نہ کرنا۔" انھوں نے سرد آواز میں کہا۔

"ہاں۔ آ۔ م۔ میں اٹھا رہا ہوں۔ یہ لیں۔"

کا ہے۔" انسپکٹر جمشید بلند آواز میں بولے۔
"ہاں۔ لیکن دیکھیے سر۔ یہ تو سٹیرنگ سے چمٹ کر رہ گیا ہے،
جیپ اب پوری طرح پانی میں ہے۔" اکرام نے بوکھلائے ہوئے
انداز میں کہا۔

اب انسپکٹر جمشید نے اس کی ناک پر ایک بھرپور مکّا مارا،
وہ چکرا گیا۔ سٹیرنگ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ انسپکٹر جمشید
نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے۔ اور جھیل میں چھلانگ لگا دی۔
وہ ان کے ساتھ ایک جھٹکے سے پانی میں گرا۔ اب وہ اسے پکڑے
کنارے کی طرف تیر رہے تھے، اکرام بھی چھلانگ لگا چکا تھا۔
ابھی چونکہ کنارے سے زیادہ دور نہیں آئے تھے، اس لیے
جلدی وہاں پہنچ گئے۔ دیہاتی پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ
رہا تھا۔ کنارے پر پہنچ کر انھوں نے اسے کندھے پر ڈالا اور
بنگلے تک آئے۔

"تم بھی آ جاؤ بھئی۔ شاید ہمیں تمھاری مدد کی بھی ضرورت
پڑے گی۔" انھوں نے دیہاتی سے کہا۔

وہ ہکا بکا سا ان کے پیچھے بنگلے میں داخل ہوا۔
اندر آ کر انھوں نے صحن میں ہی اسے فرش پر لٹا دیا۔

"اکرام! اسے باندھ لو، کیوں کہ ہوش میں آنے کے فوراً
بعد یہ پھر جھیل کا رُخ کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں ذرا

بنگلے کا جائزہ لے لوں۔"

"بہت بہتر سر۔" اس نے کہا اور جیب سے ریشم کی
ڈوری نکالنے لگا۔

انسپکٹر جمشید نے بنگلے کا جائزہ لینے کے لیے قدم
اٹھا دیے۔ اور پھر سونے کے کمرے میں انھیں لباس اور
کچھ دوسری چیزیں ایسی نظر آ گئیں۔ جنھیں وہ اچھی طرح
پہچانتے تھے۔ وہ جوش کی حالت میں واپس مڑے۔ اور
صحن میں آ گئے۔

"اکرام۔ یہ ان ہی کا بنگلہ ہے۔ اور مجرموں کا ایک
ساتھی اب ہمارے قبضے میں ہے۔ گویا ہم نے نصف میدان
مار لیا ہے۔"

"نہیں سر۔ ہم اسے نصف میدان نہیں کہہ سکتے۔" اکرام
نے سرد آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید نے چونک کر کہا۔ اور بے
ہوش آدمی کی طرف دیکھا۔ اس کی گردن ڈھلک چکی
تھی۔

"ارے۔ اسے کیا ہوا؟"

"پتا نہیں سر۔ ابھی میں نے باندھنا شروع بھی نہیں کیا
تھا کہ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور دم توڑ دیا۔"

"حیرت ہے۔ یہ لگ۔ کیسے"

ان کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ وہ تیزی سے اس کی کلائی پر جھک گئے۔

محمود محمد

جیکی نہیں چھیکی

"انکل! آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ بولتے کیوں نہیں" فرزانہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"نہ بول رہے ہیں اور نہ ہماری بات سن رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے گونگے اور بہرے ہو گئے ہوں" پروفیسر داؤد بولے۔

"حیرت ہے، تھوڑی دیر پہلے فون پر ہم سے بات کر چکے ہیں، اس وقت تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھے" محمود بولا۔

"اس کے بعد تو انھوں نے مجھ سے بھی فون پر بات کی تھی اور بتایا تھا کہ فاروق نے کوئی پروگرام بنایا ہے۔ اس سلسلے میں میری طرف روانہ ہو رہے ہیں۔ فون انھوں نے اس خیال سے کیا تھا کہ کہیں میں کسی طرف نکل نہ کھڑا ہوں۔ اور فون کرنے کے صرف پندرہ منٹ بعد یہ یہاں پہنچ گئے۔ راستا بھی قریباً پندرہ منٹ کا ہی ہے۔ ایک دو منٹ کم یا زیادہ بھی لگ جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ راستے

میں کہیں رُکے بھی نہیں ، پھر آخر انھیں یہاں پہنچ کر کیا ہو
گیا ہے۔"

"اوہ! میں سمجھ گیا" فاروق بے تحاشا مسکرا پڑا۔

"کیا سمجھ گئے ؟" پروفیسر داؤد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ کہ انکل ڈراما کر رہے ہیں"

"مجھے تو ایسا نظر نہیں آتا"

"کیوں انکل – یہ بات ٹھیک ہے نا – آپ مذاق کے موڈ
میں ہیں نا" محمود نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ،
لیکن یوں لگا جیسے انھوں نے محمود کا جملہ سنا ہی نہ ہو۔

"اُف اللہ! یہ کیا معاملہ ہے"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راستے میں کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے"
فرزانہ بڑبڑائی۔

"شاید تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے" فاروق نے اسے گھورا۔

"وہ کیسے ؟"

"اگر راستے میں کچھ ہوا ہوتا تو یہ یہاں کس طرح پہنچ سکتے
تھے – اس حالت میں کیا یہ اپنے گھر پہنچ سکتے ہیں ؟"

"کیوں انکل – کیا آپ اپنے گھر پہنچ سکتے ہیں ؟"

انھوں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

"اوہو – ہم غلطی کر رہے ہیں انکل – فوراً ڈاکٹر کو بلانا

چاہیے"

"اوہ ہاں – واقعی" پروفیسر داؤد بولے اور پھر جلدی جلدی ڈاکٹر کے
فون نمبر گھمانے لگے۔

ڈاکٹر انصاری کے آنے میں دیر نہ لگی – انھیں خان رحمان کے
بارے میں بتایا گیا ، انھوں نے معائنہ شروع کیا – آخر ان کی طرف
مڑے :

"ان کی حالت میری سمجھ سے باہر ہے – یہ بالکل خالی ذہن
ہیں – نہ کچھ سوچ سکتے ہیں ، نہ سمجھ سکتے ہیں – اور شاید کچھ
بول بھی نہیں سکتے – جسمانی طور پر یہ بالکل ٹھیک ہیں – میرے
خیال میں تو بہتر یہ رہے گا کہ کسی ماہرِ نفسیات کو بلایا جائے"

"بہت اچھا – ماہرِ نفسیات کو بھی بلا لیتے ہیں" پروفیسر داؤد
نے کہا اور پھر فون پر جھک گئے – ڈاکٹر صاحب بھی وہیں
موجود رہے – آخر ماہرِ نفسیات آ گئے – پروفیسر داؤد کے واقف
ہی تھے اور نام تھا پروفیسر باقر –

"تشریف لائیے پروفیسر صاحب – ہمیں ایک مسئلہ درپیش ہے" پروفیسر
داؤد بولے اور پھر تفصیل سنا دی –

انھوں نے خان رحمان کا جائزہ لینا شروع کیا – ان سے
بات کر کے دیکھا – ان کے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا – جسم
میں پن گھونپ کر بھی دیکھا ، لیکن خان رحمان تو بُت بنے بیٹھے

رہے۔ آخر پروفیسر باقر نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا:

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے ان کے ذہن کی پلیٹ کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ اب نہ یہ بول سکتے ہیں، نہ کسی کی بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ نہ کوئی کام کر سکتے ہیں۔"

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے پروفیسر صاحب۔ صرف ایک گھنٹہ پہلے تو یہ بالکل ٹھیک تھے۔ اب سے آدھ گھنٹہ پہلے یہ اپنے گھر سے مجھے فون کر کے میری طرف روانہ ہوئے تھے۔ یعنی گھر سے روانہ ہوتے وقت بھی ان کی ذہنی حالت بالکل ٹھیک تھی۔"

"تب پھر راستے میں شاید انہیں کوئی صدمہ پیش آیا ہے۔"

"لیکن جناب۔ ان کے جسم پر کسی چوٹ کا نشان موجود نہیں ہے۔"

"چوٹ کے نشان کے بغیر بھی صدمہ پہنچ سکتا ہے۔ انہیں میرے کلینک میں داخل کروانا پڑے گا۔ مجھے امید ہے، میں ان کی بیماری کا بہت جلد سراغ لگا لوں گا اور جب ایک بار بیماری کا سراغ لگ گیا تو علاج کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہو گا۔"

"کیوں بھئی۔ کیا خیال ہے؟" پروفیسر داؤد نے ان کی طرف

سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہم اس کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ آنٹی کو فون کر کے اطلاع دے دیتے ہیں۔ وہ بھی وہاں پہنچ جائیں گی۔"

"ہوں، یہ ٹھیک رہے گا۔"

"تو پھر میں ایمبولینس کے لیے فون کیے دیتا ہوں۔" پروفیسر باقر نے کہا اور فون کرنے لگے۔ ان کے بعد پروفیسر داؤد شہناز بیگم کو فون کرنے لگے۔

"تم ذرا میری بات سنو۔" فرزانہ نے محمود اور فاروق سے کہا اور انہیں لے کر باہر نکل آئی۔ وہ رہائشی حصے کے بیرونی دروازے کے پاس پہنچ کر رکی اور ان سے بولی:

"ایک بات بالکل طے ہے۔" اس نے کہا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کوئی بات طے تو ہے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"فرزانہ۔ تم درمیان میں رک جاتی ہو اور فاروق کو اوٹ پٹانگ جملہ [illegible] کا موقع مل جاتا ہے، لہٰذا یہ سارا قصور تمہارا ہے۔"

"شکریہ محمود۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"اور تم کس بات کا شکریہ ادا کر رہے ہو؟"

"اس بات کا کہ تم نے مجھے بالکل بے قصور قرار دے دیا

ہے۔" وہ شوخ انداز میں مسکرایا۔

"اس خیال میں نہ رہنا۔" محمود غرایا۔

"تو پھر کس خیال میں رہوں؟"

"فرزانہ، تم کیا کہہ رہی تھیں؟" محمود نے جھلا کر کہا۔

"یہ کہ کم از کم ایک بات طے ہے اور وہ یہ کہ انکل خان رحمان کو جو کچھ بھی ہوا ہے۔ راستے میں ہوا ہے۔"

"واقعی۔ بہت پتے کی بات بتائی تم نے۔ ہم تو اتنے پتے کی بات بتا بھی نہیں سکتے تھے۔" فاروق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اور چوں کہ راستا پندرہ بیس منٹ کا ہے۔ اور انھوں نے بھی قریب پندرہ منٹ ہی لگائے ہیں، اس لیے میں کہہ سکتی ہوں کہ ایک اور بات بھی طے ہے۔"

"خیر تو ہے۔ آج تم باتیں طے کرنے پر تل گئی ہو۔" فاروق نے برا سا منہ بنایا۔

"اور دوسری بات جو طے ہے۔ وہ یہ ہے کہ انکل خان رحمان کہیں بھی گاڑی سے نہیں اترے۔ گویا جو کچھ ہوا ہے گاڑی کے اندر ہوا ہے۔" اس نے پُرزور انداز میں کہا۔

"اوہ! میں تمھارے خیال سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں فرزانہ۔" محمود پُرجوش لہجے میں بولا۔

"شکریہ محمود۔ میرا خیال ہے۔ کسی شخص نے انکل کی کار میں لفٹ لی تھی اور یہ گڑبڑ اسی نے کی ہے۔ انکل تو کچھ بتا نہیں سکتے، لیکن ان کی گاڑی تو موجود ہے۔ آؤ ان کی گاڑی سے پوچھیں۔"

"یہ گاڑیاں کب سے بولنے لگیں؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"جب سے تم نے عقل سے کام لینا بند کیا۔" فرزانہ جل گئی، اور گاڑی کی طرف قدم اٹھانے لگی۔

"خبردار۔ اسے ہاتھ نہ لگانا۔ ہو سکتا ہے، اس آدمی کے ہاتھوں کے نشانات کار کے دروازوں اور اندرونی حصوں پر موجود ہوں۔ وہ نشانات ہمارے بہت کام آئیں گے۔"

"لیکن ہاتھ لگائے بغیر ہم کار کے دروازے کس طرح کھول سکتے ہیں؟" محمود نے منہ بنایا۔

"ٹھہرو۔ میں انکل اکرام کو فون کر آؤں۔ وہ فنگر پرنٹ کے ماہروں کو یہاں بھیج دیں گے۔ پہلے ہم باہر والے نشان اٹھوائیں گے۔ اس کے بعد اندرونی حصے کا جائزہ لیں گے۔"

اس نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتی اندر چلی گئی۔

"کیوں نہ یہاں ابا جان کو بھی بلا لیا جائے۔ معاملہ بہت اہم ہے۔" محمود نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں ٹھیک ہے ۔ میں یہاں ٹھہرتا ہوں ، تم فرزانہ سے کہ
آؤ" فاروق جلدی سے بولا۔
اور محمود اسے گھورتا چلا گیا ۔ جلد ہی دونوں لوٹے :
"ابا جان اور انکل اکرام دفتر میں نہیں ہیں ۔ وہ کسی
مہم پر روانہ ہو چکے ہیں ۔ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں
کہ کب آئیں گے ، تاہم انکل محمد حسین آزاد فنگر پرنٹ والوں
کو لے کر آ رہے ہیں "
"مہم کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ؟"
"نہیں ۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ۔ محمد حسین آزاد کو بھی نہیں
معلوم کہ وہ کہاں گئے ہیں ۔"
"ہوں ۔ حالات پُر اسرار سے لگتے ہیں ۔ یوں محسوس ہوتا
ہے ۔ جیسے اندر ہی اندر کوئی گہرا چکر چلنے کو ہے ۔" فاروق
بڑبڑایا ۔
"اس سے زیادہ گہرا چکر کیا چلے گا کہ ہمارے انکل خان
رحمان بے کار ہو کر رہ گئے ہیں ۔" فرزانہ نے منہ بنایا ۔
ٹھیک بیس منٹ بعد محمد حسین آزاد ماہرین کو لے کر پہنچ
گیا ۔ انھوں نے کار کے دروازوں پر نشانات ابھارے اور
انھیں محفوظ کر لیا ۔ اب انھوں نے کار کے دروازے کھول
ڈالے ۔ کار کے اندر کا جائزہ لیا گیا ، لیکن اس میں کوئی کام

کی چیز نظر نہ آئی ۔ آخر اندر سے بھی نشانات اٹھوائے گئے ،
فوٹوگرافروں نے جلد ہی بتا دیا کہ خان رحمان کے علاوہ بھی
کسی شخص کی انگلیوں کے نشانات ہیں ۔ یہ نشانات ان کے
گھر کے افراد میں سے کسی کے نہیں ہو سکتے تھے ، کیوں کہ
خان رحمان صفائی کے معاملے میں بہت وہمی تھے ، جوں ہی
گاڑی کسی جگہ سے واپس آتی تھی ، اس کی صفائی کر دی جاتی
تھی اور یہ کام ظہور کے ذمے تھا ۔
"انکل محمد حسین آزاد ۔ آپ فوراً ریکارڈ سیکشن میں جائیں اور
ان نشانات کو ملا کر دیکھیں ، اگر یہ کسی جرائم پیشہ کے ثابت
ہو جائیں تو فوراً ہمیں اطلاع دیں ۔"
"کیا آپ لوگ یہیں ملیں گے ؟"
"ہم یہاں نہیں ہوں گے تو یہاں سے آپ کو معلوم ہو
جائے گا کہ ہم کہاں ہیں ۔"
"ہوں ۔ ٹھیک ہے ۔" اس نے کہا اور ماہرین کے ساتھ
چلا گیا ۔
ٹھیک ایک گھنٹے بعد انھیں محمد حسین آزاد کی طرف
سے اطلاع ملی :
"نشانات ایک بہت پرانے مجرم کی انگلیوں کے ثابت
ہوئے ہیں ۔ کسی زمانے میں وہ جادو ٹونے کا کام کرتا تھا ۔

پولیس کو اس پر شک ہوا تو پکڑ کر اس پر کیس چلایا گیا
اور پھر اسے سزا سنا دی گئی۔ تین ماہ کی سزا کاٹ کر
نکلا۔ اس کے بعد بھی وہ اپنا وہی کام کرتا رہا۔ جادو
ٹونے کے ذریعے لوگوں کا علاج کرتا رہا۔ اس طرح اس نے
کئی دولت مندوں سے لمبی چوڑی رقمیں بٹوریں۔ ان کی شکایت
پر اسے پھر گرفتار کیا گیا اور مقدمہ چلا۔ اب اسے ایک سال
کی سزا ہوئی۔ ایک سال کی سزا کے بعد وہ باہر نکلا اور اس
کے بعد اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ یعنی اسے پھر کسی نے نہیں
دیکھا۔ اس زمانے میں اس کا ٹھکانا عالم گیر سرائے تھی۔ وہ
اپنے گاہکوں کو پھانس کر عالم گیر سرائے میں لایا کرتا تھا۔
اس سرائے کا ایک کمرہ ہمیشہ اس کے قبضے میں رہتا تھا۔"

"اس کا نام کیا تھا۔ اور سرائے کہاں واقع ہے۔ اس کا
نام بھی بتا دیں۔"

"اس جرائم پیشہ کا نام ڈاکٹر تابانی ہے۔ وہ خود کو ڈاکٹر کہتا
تھا۔ سرائے بابر روڈ پر واقع تھی۔ اس کا نام جیکی کی سرائے
تھا۔ جیکی ایک انگریز تھا۔"

"تھی سے کیا مراد ہے۔ کیا اب وہ سرائے وہاں نہیں
ہے؟"

"نہیں۔ یہ بیس سال پہلے کی باتیں ہیں۔ اب تو وہاں

ایک شان دار ہوٹل بن چکا ہے۔"

"چلیے ہوٹل کا نام ہی بتا دیں۔ اور ہاں۔ جیکی کا حلیہ بھی۔"
محمود نے کہا۔

"ہوٹل کا نام ہوٹل بوٹام ہے۔ جیکی سرخ و سفید رنگ کا
تھا، لمبے چوڑے قد کا مالک، ناک لمبی اور آنکھیں گہری نیلی
تھیں۔"

"بہت بہت شکریہ انکل۔" محمود نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔
یہ اطلاعات اس نے دونوں کو سنا دیں:

"اس کا مطلب ہے، ہمیں ہوٹل بوٹام جانا ہوگا۔ جیکی
سے سرائے ہوٹل بوٹام والوں نے خریدی ہوگی۔ تاکہ اس پر
ہوٹل بنا لیں۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں۔ بالکل یہی بات ہے۔"

تینوں وہاں سے اپنی موٹر سائیکلوں پر روانہ ہوئے:

"ایک بات بہت زیادہ عجیب ہے اور ابھی تک ہم نے
اس پر توجہ بھی نہیں دی۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"تو اب دے لیتے ہیں توجہ۔ اس سے اچھا موقع کون سا
ہوگا توجہ دینے کے لیے۔" فاروق مسکرایا۔

"انکل کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ راستے میں ہوا، پھر وہ تجربہ گاہ
تک کس طرح پہنچ گئے۔ انھیں تو راستے میں ہی کہیں گم ہو

جانا چاہیے تھا۔"

"واقعی۔ یہ بات بہت اہم ہے۔" محمود نے فوراً کہا۔

"اہم کو کیا ہم چاٹیں۔ جب اس کی وجہ ہی سمجھ میں نہیں آ سکی۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"جلنے بھننے اور تلملانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ عقل سے کام لینے سے ہی کام بنے گا۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"عقل سے کام لینے کے لیے تم کیا کم ہو۔" اس نے منہ بنایا۔

"بس خاموش۔ ہم بابر روڈ پر پہنچ گئے ہیں اور ہوٹل ہوشام کا سائن بورڈ مجھے یہاں سے ہی نظر آنے لگا ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ بہت بڑا ہوٹل ہے۔"

"ہو گا ہمیں کیا۔" فاروق نے کہا۔

ہوٹل واقعی بہت بڑا اور عالی شان تھا۔ وہ موٹر سائیکلوں سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھے۔ اندر ہال کھچا کھچ بھرا تھا اور لوگ کھانے پینے میں مشغول تھے۔ وہ رکے بغیر کاؤنٹر پر پہنچے:

"ہمیں مسٹر جیکی سے ملنا ہے۔"

کاؤنٹر کلرک نے انھیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا، پھر جھلا کر بولا:

"کون مسٹر جیکی۔"

"اس ہوٹل کے مالک۔" محمود نے کہا۔

"شاید تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ اس ہوٹل کے مالک کا نام مسٹر فیروزا ہے۔"

"اوہ معاف کیجیے گا۔ ہم نے غلط اندازہ لگایا۔ تو ہمیں مسٹر فیروزا سے ہی ملا دیں۔"

"وہ اس طرح کسی سے نہیں ملتے۔" اس نے تلملا کر کہا۔

"تو پھر کس طرح ملتے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"پہلے سے وقت لینا ہو گا۔ کام کی نوعیت بھی بتانا ہو گی۔ اگر مسٹر فیروزا ملنا پسند کریں گے تو ملاقات کا وقت دے دیں گے۔"

"لیکن ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اور کام بہت ضروری ہے۔ صرف ہمارے لیے ہی نہیں۔ مسٹر جیکی کے لیے بھی۔"

"جیکی نہیں۔ فیروزا۔"

"اوہ ہاں، میں پھر بھول گیا، معاف کیجیے گا۔ ان تو ہیں کہ ذرا اتنا کر ہمیں فوری طور پر ان سے ملوا دیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ اپنے کارڈ دے دیں۔ میں وقت لے دیتا ہوں۔ کارڈ کی پشت پر یہ بھی لکھ دیں کہ کس غرض سے ملنا ہے۔"

"جی نہیں۔ ہم ابھی اور اسی وقت ملیں گے۔ اگر وہ نہ ملے تو یہ ہوٹل ایک سرائے میں تبدیل ہو جائے گا اور اس سرائے

کا نام جیکی کی سرائے رکھا جائے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"اب ہم مطلب کس بات کا بتائیں۔ آسان الفاظ میں تو بات کر رہے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اور دوسرے یہ کہ اگر آپ نے ہماری ان سے ملاقات نہ کروائی تو پھر یہ ملاقات قانون کے ذریعے کی جائے گی۔" محمود نے کہا۔

"قانون کے ذریعے۔ کیا مطلب؟"

"ایک تو آپ مطلب بہت پوچھتے ہیں۔ اب ہم کس کس بات کا مطلب بتائیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ قانون کا مطلب قانون ہوتا ہے۔ وہ جو ہتھکڑیاں لے کر آتے ہیں۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اگر مسٹر فیروزا نے تم لوگوں سے ملاقات نہ کی تو پولیس کے ذریعے ملاقات کرو گے؟"

"ہاں! یہی بات ہے۔"

"میرا خیال ہے، تم لوگوں کا واقعی دماغ چل گیا ہے۔"

"بہتر ہو گا کہ اپنے مسٹر فیروزا سے پہلے بات کر لیں۔ کہیں ان کا نزلہ آپ پر نہ گرے۔"

"ہوں۔ تم لوگوں کو سبق دینے کے لیے ان سے بات کرنا ہی ہو گی۔" اس نے ہنس کر کہا اور پھر فون کا ریسیور اٹھا کر ایک

بٹن دباتے ہوئے بولا:

"ہیلو سر۔ یہاں تین سر پھرے افراد موجود ہیں۔"

"تو پھر۔ میں کیا کروں۔" آواز ابھری۔

"وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں اور پولیس کی دھمکی بھی دے رہے ہیں۔"

"شاید ان کے ساتھ تمہارا بھی دماغ چل گیا ہے۔ اٹھا کر باہر پھنکوا دو۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہو گا جناب۔" محمود نے منہ ریسیور کے قریب کر کے کہا۔

"اوہو۔ یہ ان میں سے ایک کی آواز ہے؟"

"جی ہاں!"

"یہ لوگ ہیں کون؟"

"ابھی تک میں نے ان کے نام نہیں پوچھے۔"

"تو پوچھو نا۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔ یہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔"

"محمود، فاروق اور فرزانہ نام ہیں ہمارے۔" محمود بولا۔

"کیا!" کاؤنٹر کلرک نے بوکھلا کر کہا۔

"تو یہ انسپکٹر جمشید کے بچے ہیں۔ ان سے الجھنے کی کیا ضرورت تھی۔ پہلے ہی نام معلوم کر لیتے۔ چھا گئی۔"

"یس سر" کلرک نے گھبرا کر کہا۔

"چھاگی۔ تم ایک دم الّو کے پٹھے ہو"

"جج۔ جی ہاں سر" اس نے کانپ کر کہا۔

"ان لوگوں کو فوراً میرے پاس بھیج دو۔ میں ان سے ملاقات کروں گا"

"او کے سر" یہ کہہ کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ فوراً ہی ایک بیرا کاؤنٹر پر آگیا :

"انھیں سر کے پاس لے جاؤ"

"جی بہتر" اس نے کہا اور ان تینوں کو لے چلا۔

ایک کمرے کے دروازے پر رُک کر اس نے دستک دی۔ اندر سے پھنکارتی آواز سنائی دی :

"آ جاؤ" اس آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ اور وہ اندر داخل ہو گئے۔ بیرا وہیں سے واپس پلٹ گیا۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ انھوں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا ، لیکن وہاں دروازہ بند کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

"یہ دروازہ آٹو میٹک ہے۔ اب جب تک میں نہ چاہوں نہیں کھلے گا۔ گویا تم میری مرضی کے بغیر باہر نہیں نکل سکو گے"

انھوں نے سامنے دیکھا۔ ایک بڑے سے صوفے پر سفید

بالوں والا ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ اس کا جسم بھاری بھر کم اور قد لمبا تھا ، ناک کی نوک اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ آنکھیں سبز رنگ کی تھیں۔ انھوں نے جیکی کا حلیہ یاد کیا ، اس کی ناک انھیں لمبی بتائی گئی تھی اور آنکھیں گہری نیلی ، لیکن اس شخص کی ناک کی نوک اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور آنکھیں سبز تھیں۔

"مسٹر جیکی۔ یہ آپ ہیں" محمود نے کچھ سوچ کر کہا۔

"جیکی۔ کون جیکی ؟"

"جیکی سرائے کا مالک۔ وہ سرائے اسی جگہ تھی جہاں آج یہ ہوٹل موجود ہے"

"او میں سمجھا۔ تم اس جادوگر کی بات کر رہے ہو۔ پتا نہیں وہ کہاں ہو گا۔ اور شاید مر کھپ گیا ہو گا" اس نے کہا۔

"کیا یہ زمین آپ نے ہی اس سے خریدی تھی ؟"

"ہاں ، یہ ٹھیک ہے"

"آپ نے کیا کہا ہے۔ ہم آپ کی مرضی کے بغیر اس کمرے سے نہیں نکل سکتے"

"ہاں ، یہی کہا تھا ، اگر نیک ارادے سے آئے ہو تو میں خود تمھیں جانے کی اجازت دوں گا ، ورنہ پولیس کے

حوالے کروں گا۔"

"اس شہر کی پولیس ہمیں ہاتھ نہیں لگائے گی، تجربہ کر کے دیکھ لیں۔" محمود مسکرایا۔

"اگر کوئی جرم کرو گے، پھر بھی نہیں پکڑے گی؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں! اس صورت میں ضرور پکڑے گی، لیکن ہم جرم کریں گے ہی کیوں؟"

"اور اگر میں یہ الزام لگاؤں کہ تم بغیر اجازت میرے کمرے میں داخل ہوئے ہو؟"

"تو ہم پولیس کو بتائیں گے کہ آپ کا بیان غلط ہے، کیونکہ آپ کے کمرے کا دروازہ تو آٹومیٹک ہے۔ صرف آپ کی مرضی سے کھلتا اور بند ہوتا ہے۔ ہم آپ کی مرضی کے بغیر کس طرح داخل ہو سکتے ہیں؟" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"ہوں۔ بہت چالاک ہو۔ خیر۔ میں نے یہ ارادہ ترک کیا، اب بتاؤ۔ کیوں آئے ہو؟"

"جیکی سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"میں بتا چکا ہوں۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"اپنی انگلیوں کے نشانات دے دیں۔" فرزانہ نے سرسراتے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ہمارے ایک عزیز کی کار پر ایک شخص کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔ اس کار میں کوئی واردات کی گئی ہے۔"

"تو پھر۔ میں کیوں نشانات دے دوں۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ جیکی ہیں یا نہیں۔"

"نہیں۔ میں جیکی نہیں ہوں۔ کیا نشانات جیکی کے ملے ہیں؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتے۔ اس کا ایک نام ڈاکٹر تابانی ہے، ہو سکتا ہے، دوسرا نام جیکی ہو۔"

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے۔ ایک منٹ ٹھہرو۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور بغلی دروازہ کھول کر دوسری طرف چلا گیا۔

جلد ہی وہ واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید کاغذ تھا اور اس پر انگلیوں کے نشانات بنے ہوئے تھے۔ اس نے کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا؛

"تو یہ آپ کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔" فاروق بولا۔

"ہاں بالکل!" اس نے فوراً کہا۔

"لیکن ہم چاہتے ہیں۔ آپ نشانات ہمارے سامنے بنائیں۔" فرزانہ نے فوراً کہا۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے کسی اور کی انگلیوں کے نشانات اس کاغذ پر بنوا دیے ہیں؟"

"نہیں یہ سمجھنا ہی چاہیے۔"

"بہت چالاک ہو اور وہمی بھی۔ خیر۔ یہ لو۔ آنکھیں کھول کر دیکھو۔"

اس نے ایک دوسرا کاغذ لیا۔ میز پر رکھا، رنگ پیڈ اُٹھایا اور اس سے کاغذ پر نشانات بنانے لگا، پھر اس نے کہا:

"اب تو تمھارا اطمینان ہو گیا۔"

"صرف اس حد تک کہ اب اس کاغذ پر جو نشانات ہیں وہ آپ کے ہی ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"چلو اتنا ہی بہت ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا اور کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا۔

محمود نے کاغذ لیا اور تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو اب ہم جانا چاہتے ہیں۔"

"ضرور۔ کیوں نہیں۔" اس نے کہا۔

وہ باہر نکل آئے۔ کاؤنٹر کلرک نے انھیں حیرت زدہ انداز میں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو:

"حیرت ہے۔ تم زندہ سلامت لوٹ آئے ہو۔"

اور وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔ باہر نکل کر وہ فنگر پرنٹ سیکشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ جلد ہی ماہرین نشانات کا جائزہ لے رہے تھے۔ آخر انھوں نے بتایا:

"جی نہیں۔ یہ نشانات ڈاکٹر تابانی کے نہیں ہیں، ریکارڈ سے جیکی کی انگلیوں کے نشانات بھی مل گئے تھے، یہ نشانات جیکی کے بھی ثابت نہیں ہوئے۔"

نے جان بوجھ کر صدر گوانا سے ملاقات نہیں کی۔ اب ظاہر ہے، ہمارا ملک یہ خبر تو شائع کر نہیں سکتا کہ صدر صاحب کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ لہٰذا اکرام ہمیں ہر حال میں صدر صاحب کو تلاش کرنا ہے۔"

"اوہ! یہ تو واقعی بہت خوف ناک بات ہے۔ اب کیا ہو گا؟"

"ٹھہرو۔ پہلے میں ایک فون کروں گا۔"

یہ کہ کر انھوں نے جلدی جلدی نمبر گھمائے، پھر بولے:

"ہیلو سر۔ آپ کا خادم بول رہا ہوں۔"

"سناؤ جمشید۔ صدر صاحب کا کچھ پتا چلا؟ تم کہاں سے فون کر رہے ہو؟"

"یہ نہ پوچھیے سر کہ میں کہاں سے بول رہا ہوں۔ میری طرف سے یہ اطمینان قبول کریں کہ صدر مملکت کل وقتِ مقررہ پر ایئرپورٹ پر موجود ہوں گے۔"

"بھئی واہ جمشید۔ ملک اور قوم کا ہمدرد ہو تو تم جیسا۔ قوم تم پر جس قدر فخر کرے، کم ہے۔"

"اس بات کو چھوڑیے سر۔ ایک بات نوٹ کر لیں۔ کل ٹھیک چار بجے صدر صاحب کے لیے ایک کار شمال مغربی سڑک کے پچیسویں کلومیٹر پر پہنچا دی جائے۔ ڈرائیور ساتھ ہونا چاہیے۔"

"لیکن کیوں جمشید۔ صدر صاحب تو اپنی کار پر گئے تھے۔"

"کسی وجہ سے ان کا اس کار پر آنا ممکن نہیں۔" وہ بولے۔

"جمشید۔ کیا تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟" آئی جی شیخ نثار احمد نے چونک کر کہا۔

"اگر ایسی کوئی بات ہے تو یہ بات بھی قوم کے فائدے کے پیشِ نظر ہے سر۔"

"ٹھیک ہے جمشید۔ میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔"

"شکریہ سر۔ خدا حافظ۔" وہ بولے۔

"اللہ حافظ۔" یہ کہتے ہوئے آئی جی صاحب نے ریسیور رکھ دیا۔

"یہ کیا سر۔ اگر ہم صدر صاحب کو تلاش نہ کر سکے۔"

"دیکھتے جاؤ اکرام۔ کیا ہوتا ہے۔" انھوں نے کہا اور پھر بنگلے کے معائنے میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے مختلف جگہوں سے انگلیوں کے نشانات بھی اٹھائے، مرنے والے شخص کی انگلیوں کے نشانات ایک کاغذ پر لیے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لاش کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا، دیہاتی کو سمجھا دیا کہ کسی سے بھی اس بنگلے کے بارے میں کوئی بات نہ کرے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ ریکارڈ سیکشن میں موجود تھے۔ اور ماہرین ان نشانات کا جائزہ لے رہے تھے۔ آخر انچارج رپورٹ لے کر ان کے پاس آیا:

"مختلف جگہوں سے ملنے والے نشانات ایک شخص ابرار باچا کے ہیں۔ آپ جس شخص کی انگلیوں کے نشانات بنا کر لائے ہیں، وہ بھی ابرار باچا کے ہی ہیں۔"

"اکرام! ابرار باچا کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" انسپکٹر جمشید اس کی طرف مڑے۔

"ابرار باچا ایک جواری تھا۔ جوا کھیلنے کے جرم میں کئی بار پکڑا گیا۔ اس کا ٹھکانا جیکی کی سرائے تھا۔ وہ وہاں جواریوں کو گھیر گھار کر لے جاتا تھا اور وہاں سے جوے کے ذریعے بڑی بڑی رقوم اینٹھ لیتا تھا۔"

"کیا ان دنوں اس کے بارے میں کبھی کچھ سننے میں نہیں آیا؟"

"جی نہیں۔ مدت ہوئی۔ اس کا ذکر نہیں سنا۔ آج نام سامنے آیا ہے تو یاد آیا۔ میں نے تو بنگلے میں پہچانا بھی نہیں۔" اکرام بولا۔

"اس کا مطلب ہے۔ ہمیں جیکی کی سرائے جانا ہوگا۔"

"افسوس! آپ جیکی کی سرائے نہیں جا سکیں گے۔" اس نے کہا۔

"کیوں۔ ایسی کیا بات ہے؟" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس لیے کہ جیکی۔ یعنی سرائے کا مالک سرائے فروخت کر کے کہیں چلا گیا تھا۔ اور یہ اس لیے ہوا تھا کہ پولیس جیکی پر شک کرنے لگ گئی تھی۔ لہذا اس نے چپ چپاتے سرائے فروخت کی اور غائب ہو گیا۔"

"اور جیکی کی سرائے کس نے خریدی تھی؟"

"مسٹر فیروزا نے۔ سرائے خرید کر اس نے اسی جگہ ایک شان دار ہوٹل تعمیر کرایا۔ ہوٹل کا نام ہوٹل بوٹام ہے۔"

"اس کا مطلب ہے۔ ہمیں ہوٹل بوٹام جانا ہوگا۔"

"ہاں! اس کے سوا کیا چارۂ کار ہے۔"

"تو پھر آؤ چلیں۔"

چند منٹ بعد ان کی جیپ تیز رفتاری سے ہوٹل بوٹام کی طرف جا رہی تھی۔ کاؤنٹر پر رک کر انسپکٹر جمشید نے سرد آواز میں کہا:

"ہمیں مسٹر فیروزا سے ملنا ہے۔"

"جج۔ جی بہتر۔" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے اس کی آنکھوں میں الجھن پڑھ لی۔ ادھر وہ ریسیور اٹھا کر ایک بٹن دبا چکا تھا:

"ہیلو سر۔ انسپکٹر جمشید صاحب آپ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ بھیج دو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"آپ لوگ تشریف لے جائیے۔ میں بیرے کو ساتھ بھیج رہا ہوں۔" اس نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

"شکریہ۔ تشریف لے جانے کی ایسی جلدی بھی نہیں۔ تم یہ بتاؤ۔ تمہاری آنکھوں میں اُلجھن کیوں ہے؟"

"جی۔ کوئی خاص بات نہیں۔ آپ جیسے لوگوں کا کسی جگہ آنا اُلجھن کا باعث بن سکتا ہے۔"

"نہیں۔ کوئی اور بات ہے۔" وہ بولے۔

"پھر آپ خود ہی بتائیں۔ کیا بات ہو سکتی ہے۔" اس نے بے چارگی کے عالم میں کندھے اچکائے۔

"اچھی بات ہے۔ پہلے میں مسٹر فیروزا سے مل لوں، پھر بتاؤں گا، تم کیوں پریشان ہو۔"

وہ ایک بیرے کے ساتھ فیروزا کے کمرے تک پہنچے۔ دروازہ خود بخود کھل گیا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا۔

"تو آٹومیٹک دروازے ہیں اس ہوٹل کے۔"

"ہوٹل کے نہیں۔ صرف میرے دفتر کے۔" فیروزا نے کہا۔

"آپ جانتے ہیں، میں کس لیے آیا ہوں۔"

"میں نے علم نجوم نہیں سیکھا۔"

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ ہوٹل ہومام کی جگہ پہلے جیکی کی سرائے تھی۔ آپ نے وہ سرائے جیکی سے خریدی تھی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

"اگر میں یہ پوچھوں کہ جیکی کہاں ہے تو تم کہو گے۔ میں کیا جانوں، لہٰذا میں یہ سوال دوسری طرح کرتا ہوں۔" یہ کہتے وقت انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"دوسری طرح سے آپ کی کیا مراد ہے؟" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"دوسری طرح سے میری مراد یہ ہے کہ اگر تم میری ملاقات جیکی سے کرا دو تو میں اس ہوٹل کے خلاف تحقیقات نہیں کروں گا۔ صرف جیکی کے خلاف قدم اٹھاؤں گا۔"

"کیا مطلب۔ آپ میرے ہوٹل کے خلاف تحقیقات نہیں کریں گے۔ کیا میرے ہوٹل میں کوئی جرم ہو رہا ہے؟" اس نے جھلا کر کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ تمہارے کاؤنٹر کلرک کی مہربانی سے یہ بات میرے علم میں آ چکی ہے کہ یہاں جرائم پلتے ہیں، جرائم کام ہوتے ہیں۔"

"کیا کہا۔ میرے کاؤنٹر کلرک نے یہ بات آپ کو بتائی ہے نا نہیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ یہ غلط ہے۔ وہ میرا با اعتماد ساتھی

ہے اور ہوٹل کا پوری طرح وفادار ہے ۔ وہ ایسی کوئی بات نہیں کر سکتا ۔"

"بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو زبان سے نہیں بتائی جاتیں ۔ آدمی اپنی حرکات اور سکنات سے دوسروں پر ظاہر کر دیتا ہے ۔ کاؤنٹر کلرک نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی ۔ آخر کیوں ۔ اگر یہاں کوئی غلط کام نہیں ہوتا تو پھر وہ الجھن میں کیوں مبتلا ہو گیا تھا ؟"

"آپ کی شخصیت نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا ہو گا کہ آپ کا بھلا یہاں کیا کام ؟" اس نے فوراً کہا ۔

"خیر اسے چھوڑیں ۔ اگر میں نے یہاں کا معائنہ کر لیا اور یہاں مجرمانہ سرگرمیاں ثابت ہو گئیں تو آپ کہاں ہوں گے ، یہ سوچ لیں ۔ بہتر ہو گا کہ آپ جیکی کا پتا بتا دیں ۔"

"افسوس ! میں نہیں جانتا ۔"

"اچھی بات ہے ۔ تمھاری مرضی ۔" یہ کہ کر انھوں نے میز پر رکھے فون کا ریسیور اٹھا لیا اور دفتر کے نمبر ڈائل کرنے لگے ۔ جوں ہی سلسلہ ملا ، وہ بولے :

"سر ! میں اس وقت ہوٹل بوٹام میں موجود ہوں ۔ اور اس کی پوری طرح تلاشی چاہتا ہوں ۔ مہربانی فرما کر فوری انتظام کر دیں ، تاکہ یہاں سے ایک شخص بھی بچ کر نہ جا سکے ۔"

"کیا مطلب ۔ بھلا ہمیں بھاگنے کی کیا ضرورت ہے ؟" مسٹر فیروزا نے تلملا کر کہا ۔

"بہت اچھا جمشید ، تم فکر نہ کرو ۔" دوسری طرف سے آئی جی بولے ۔ اور انسپکٹر جمشید نے ریسیور رکھ دیا ۔ پھر مسکرا کر بولے :

"آپ نے کیا کہا ؟"

"یہ کہ ہمیں بھاگنے کی کیا ضرورت ہے ؟"

"معلوم ہو جاتا ہے ۔ ویسے اب بھی وقت ہے ۔ ہمیں جیکی سے ملوا دیں ۔"

"افسوس ۔ میں نہیں جانتا ۔"

"یہ جیکی اپنی سرائے میں کرتا کیا تھا ؟"

"پتا نہیں ۔ بھلا میں کیا بتا سکتا ہوں ۔"

"آپ کو سرائے خریدنے کا خیال کس طرح آ گیا تھا ؟"

"وہ ملک سے باہر جانا چاہتا تھا ، میں ان دنوں اپنا ہوٹل بنانے کے چکر میں تھا ۔ بس میں نے سرائے خرید لی ۔"

"زمین کے کاغذات تو ہوں گے آپ کے پاس ۔ یعنی رجسٹری کے کاغذات ۔"

"ہاں ، کیوں نہیں ۔"

"دکھا سکتے ہیں ؟" وہ بولے ۔

"ضرور کیوں نہیں دکھا سکتا۔"

"تو پھر مہربانی فرما کر دکھا دیں۔"

"یہاں نہیں ہیں، اس کے لیے مجھے ایک اور کمرے میں جانا ہوگا۔"

"اکرام! ان کے ساتھ جاؤ۔"

"اوکے سر۔" اکرام نے فوراً کہا۔

چند لمحے کے لیے مسٹر فیروزا کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار نظر آئے۔ وہ ایک دو سیکنڈ تک ہیپر ویٹ کو گھماتا رہا۔ آخر اُٹھا اور اکرام کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ وہ بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ تین منٹ گزرنے پر بھی اکرام اور فیروزا نہ لوٹے تو انھیں پریشانی ہونے لگی۔ جمشید اُٹھ کر اُٹھے اور دروازے پر پہنچے، لیکن دروازہ تو بند تھا۔ انھوں نے کھولنے کی کوشش کی، لیکن نہ کھلا۔ پھر کسی خیال کے تحت وہ اس میز کی طرف آئے۔ جس کے دوسری طرف رکھی کرسی پر فیروزا بیٹھا تھا۔ انھوں نے اس میز کا جائزہ لیا اور پائے میں لگے مختلف بٹن باری باری دباتے چلے گئے۔ اچانک میز پر رکھے ایک عجیب سے آلے سے آواز اُبھری:

"ہاں مسٹر فیروزا۔ کیا بات ہے؟"

"جی۔ جی وہ۔" انسپکٹر جمشید نے حلق سے مسٹر فیروزا کی آواز نکالی۔

"بٹن دبایا ہے تو کوئی بات کہنے کے لیے دبایا ہے۔ اب وہ بات کہتے کیوں نہیں؟" دوسری طرف سے جھلاہٹ کے عالم میں کہا گیا۔

"سر۔ انسپکٹر جمشید میرے ہوٹل کی تلاشی لینا چاہتا ہے۔" وہ بولے۔

"اوہ!" دوسری طرف سے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

"پھر۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"کچھ بھی ہو فیروزا۔ ہوٹل جائے جہنم میں۔ تم اس کے ہاتھ ہرگز نہیں لگو گے۔ ہمارے لیے ہوٹل قیمتی نہیں۔ تم قیمتی ہو۔"

"اوکے سر۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"تو پھر اس طرف سے اجازت ہے۔ جو دل میں آئے کرو۔ نکل بھاگنا ضروری ہو جائے تو نکل بھاگو۔ انسپکٹر جمشید کو ختم کرنے کا موقع نظر آئے تو ختم کر دو۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

اور آواز آنا بند ہو گئی۔ انسپکٹر جمشید نے اس بٹن کو دبا دیا اور آلے کے ننھے منے بلب بجھ گئے۔ دروازہ کھولنے کے چکر میں وہ فیروزا کے باس کو آواز دے بیٹھے تھے۔ اب انھوں

نے ایک اور بٹن دبایا ، فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ اور وہ دوڑ کر
کمرے سے نکل آئے۔ باہر ہر چیز معمول پر تھی۔ اکرام اور
فیروزا کہیں نظر نہ آئے۔ انسپکٹر جمشید ہال کی بجائے اندر کی
طرف بڑھے اور پھر جو کمرہ نظر آیا۔ اس کا دروازہ دھکیل کر
اندر داخل ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ چونک اٹھے۔ اکرام کمرے
کے فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔

وہی کاغذ

"افسوس ہمارا خیال غلط نکلا۔ مسٹر فیروزا جیکی نہیں ہے۔"
محمود بڑبڑایا۔

"فرض کیا وہ جیکی ثابت ہو جاتا ، پھر ہم کیا کرتے" فاروق
نے کہا۔

"اس صورت میں اس سے ڈاکٹر تابانی کے بارے میں پوچھا
جاتا ، کیوں کہ ڈاکٹر تابانی اس کی سرائے میں رہا کرتا تھا"

"لیکن یہ ضروری نہیں کہ اسے ڈاکٹر تابانی کے بارے میں کچھ یاد
بھی ہو۔ یہ آج کل کی تو بات نہیں ہے"

"اوہو۔ ارے" فرزانہ نے قریب قریب اچھل کر کہا۔

"اب اوہو ارے کی وضاحت بھی کر دو" فاروق نے
جل بھن کر کہا۔

"ہم۔ ہم سے غلطی ہوئی" فرزانہ نے بوکھلائے ہوئے
لہجے میں کہا۔

"غلطی ہوئی۔ کیا مطلب؟" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"غلطی یہ ہوئی کہ۔ مگر نہیں۔ یوں مزا نہیں آئے گا۔ آؤ میرے ساتھ۔" فرزانہ نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

"ارے۔ کیا ہو گیا ہے بھئی۔ کچھ بتاؤ بھی تو۔"

"بتا رہی ہوں۔ پہلے آ جاؤ۔" فرزانہ مسکرائی۔

آخر تینوں دوڑتے ہوئے اس جگہ پہنچے جہاں موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ موٹر سائیکلوں پر اڑے جا رہے تھے۔

"کچھ پتا بھی چلے۔ بات کیا ہے؟"

"کچھ نہ پوچھو، تم دونوں عقل سے بالکل پیدل ہو۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"اور خود اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ہم۔ میں بھی۔ جب تمہارے ساتھ ہوتی ہوں تو عقل سے پیدل ہو جاتی ہوں۔"

"تب تو تمہیں چاہیے۔ ہمارے ساتھ ہرگز نہ رہا کرو۔ ایسا نہ ہو۔ مکمل طور پر عقل سے پیدل ہو جاؤ۔"

"ثابت ہو گیا۔" محمود گنگنایا۔

"کیا ثابت ہو گیا۔ یہ کہ فرزانہ خود بھی عقل سے پیدل ہے۔" فاروق جلدی سے بولا۔

"یہ تو خیر پہلے ہی ثابت ہو گیا تھا۔ اس وقت تو یہ ثابت ہوا

ہے کہ فرزانہ منزلِ مقصود پر پہنچ کر ہی کچھ بتائے گی۔"

"محمود۔ تم نے بالکل درست اندازہ لگایا، تمہارے اندازے کی داد دینا پڑے گی۔" فرزانہ شوخ لہجے میں بولی۔

"لو بھئی۔ داد وصول کرو۔" فاروق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"شش۔ شکریہ۔ سوال یہ ہے کہ جانا کہاں ہے؟"

"ہوٹل برٹام۔ یعنی وہیں جہاں سے آئے ہیں۔"

"اب وہاں جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"وہاں چل کر اپنی عقل پر ماتم کریں گے۔"

"ماتم کرنا گناہ ہے۔" محمود فوراً بولا۔

"میں نے محاورۃً کہا ہے۔"

"جو چیز گناہ ہے۔ وہ محاورۃً بھی گناہ ہی ہو گی۔"

"اچھا خیر۔ میں اپنا جملہ واپس لیتا ہوں۔" اس نے تنگ آ کر کہا۔

ہوٹل برٹام کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک گئے۔ اس کے گرد پولیس گھیرا ڈال رہی تھی۔

"شاید ہم لیٹ ہو گئے۔ اور کوئی ہم سے پہلے ہوٹل پر ہاتھ مار گیا۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"ہوٹل پر ہاتھ مار گیا۔ یہ تم کیا کہ رہی ہو۔"

"آؤ" اس نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھی، اس وقت تک وہ موٹر سائیکلیں کھڑی کر چکے تھے۔

جوں ہی تینوں ہوٹل کے دروازے کے نزدیک پہنچے، ایک حوالدار ان کے راستے میں آگیا:

"ہوٹل میں داخلہ بند ہے۔"

"کیوں۔ کیا ہوا؟ تھوڑی دیر پہلے تو داخلہ کھلا تھا۔"

"ہوٹل کی تلاشی لی جائے گی۔ اندر کچھ گڑبڑ ہے۔"

"اوہ! اس صورت میں تو ہمارا اندر جانا اور بھی ضروری ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ ہمیں پہچانتے نہیں۔ آپ کے انچارج کون ہیں؟"

"ڈی ایس پی کریم نواز صاحب۔ کیوں؟"

"ٹھیک ہے۔ ہم ان سے بات کر لیتے ہیں۔ وہ ہمیں جانتے ہیں۔"

"بات کیا ہے، آپ لوگ اندر کیوں جانا چاہتے ہیں؟"

"یہ ہم مسٹر کریم نواز کو ہی بتائیں گے۔"

"شکریہ! وہ دیکھیے۔ کریم نواز صاحب ادھر ہی چلے آ رہے ہیں۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اسی وقت ایک بھاری بھرکم آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"یہ تم کیا کر رہے ہو غفور خان۔ یہاں تمھیں باتیں کرنے

کے لیے نہیں لایا گیا۔"

"یس سر۔ یس سر۔" حوالدار نے گھبرا کر کہا۔

اتنے میں محمود، فاروق اور فرزانہ کریم نواز کی طرف مڑ چکے تھے:

"ارے۔ آپ لوگ۔ تو آپ کو بھی اطلاع دے دی انھوں نے۔"

"جی کیسی اطلاع۔ کن کی بات کر رہے ہیں آپ؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"انسپکٹر جمشید صاحب کی۔ وہ اندر ہی موجود ہیں۔ انھوں نے ہی اس ہوٹل کو گھیرے میں لینے کا حکم دیا تھا۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا، پھر محمود بولا:

"تب تو ہمیں فوراً اندر پہنچ جانا چاہیے۔"

"ضرور ضرور۔ کیوں نہیں۔" کریم نواز مسکرائے۔

حوالدار نے انھیں حیرت زدہ انداز میں دیکھا اور پھر جب وہ اندر کی طرف بڑھ گئے تو اس نے کریم نواز سے پوچھا:

"کیا یہ انسپکٹر جمشید کے بچے ہیں سر؟"

"ہاں بھئی۔ ان کا بھی جواب نہیں، سر ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں، دین، ملک اور قوم کے لیے۔"

"واقعی!" حوالدار کے منہ سے نکلا اور جلدی سے اندر دیکھا۔ لیکن وہ تو نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

"ظفر خان - پوری طرح چوکس رہنا - ایسا نہ ہو - کوئی باہر نکل جانے میں کامیاب ہو جائے اور انسپکٹر جمشید کو اسی آدمی کی ضرورت ہو۔" کریم نواز فکر مندانہ لہجے میں بولے۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں - لیکن سر - انسپکٹر جمشید تو خود یہاں نظر آتے ہی نہیں۔"

"ان لوگوں کا طریقہ کار بہت عجیب ہے - اس وقت بھی معلوم نہیں - ان کا کیا پروگرام ہے۔" کریم نواز نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

محمود، فاروق اور فرزانہ نے اندر داخل ہونے کے بعد ایک نظر سب لوگوں پر ڈالی - سب کے سب سہمے ہوئے نظر آئے۔ وہ رُکے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ مسٹر فیروزا کے کمرے تک پہنچ گئے - فرزانہ نے آگے بڑھ کر دستک دی، لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔

"اب کیا کریں - دروازہ تو اندر سے بند ہے - اور مسٹر فیروزا شاید اندر نہیں ہیں - جب کہ ہمیں اندر ضرور داخل ہونا ہے۔"

"پہلے تو تم یہ بتاؤ کہ ہمیں اندر کیوں داخل ہونا ہے۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"ہاں! اب تو بتاؤ گی نا۔" محمود مسکرایا۔

"پہلے دروازہ کھلوایا جائے گا - محمود - کام بہت ضروری ہے۔

کریم نواز صاحب کو ادھر ہی بلا لاؤ - ہم ان کی مدد سے دروازہ کھلوائیں گے۔" فرزانہ جلدی جلدی بولی۔

"اچھی بات ہے۔" اس نے کہا اور باہر کی طرف چلا گیا۔

کریم نواز اب دروازے پر نہیں تھے۔

"کیوں بھئی - ڈی ایس پی صاحب کہاں ہیں؟"

"پولیس کے گھیرے کا جائزہ لینے گئے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے - مجھے ہوٹل کے گرد چکر لگانا پڑے گا۔"

"ہاں! بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔" حوالدار بولا۔

"لیکن میرے لیے چکر لگانا بھی اُلجھن کا باعث بنے گا - میں یہاں ٹھہرتا ہوں - آپ ذرا انہیں یہاں لے آئیں - بہت ضروری کام ہے۔"

"اچھی بات ہے، لیکن یہ دیکھ لیں - کہیں وہ مجھ پر بگڑیں۔" اس نے کہا۔

"فکر نہ کریں - میں ان سے بات کر لوں گا۔"

حوالدار تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا، آخر تین منٹ بعد کریم نواز کے ساتھ دروازے پر آ گیا۔

"ہاں بھئی - کیا بات ہے؟"

"آپ کی ہمیں اندر ضرورت ہے - جلدی چلیے۔"

"لیکن آئی جی صاحب کے احکام ... یہ اپنی جگہ ہیں صرف انسپکٹر

جمشید صاحب کی ہدایات پر عمل کریں گے۔"

"وہ اس وقت نہ جانے کہاں ہیں۔ اور معاملہ بہت اہم ہے۔ ایک بہت اہم ثبوت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، اگر آپ نے ہمارا ساتھ نہ دیا۔"

"اچھا خیر، لیکن ذمے داری آپ لوگوں پر ہوگی۔"

"ہاں ہاں۔ آپ فکر نہ کریں۔ چند کانسٹیبل ساتھ لے لیں۔"

آدھ منٹ بعد وہ چند کانسٹیبلوں کے ساتھ اندر داخل ہو رہے تھے۔ کاؤنٹر کے پاس سے گزرتے ہوئے محمود نے کہا۔

"ان صاحب کو بھی ساتھ لے لیں۔"

اس کی آواز سن کر کلرک چونکا۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں حیرت دوڑ گئی۔ کریم نواز نے اسے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ آخر وہ مسٹر فیروزا کے کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں فاروق اور فرزانہ بتوں کے توں کھڑے تھے۔

"ہمیں اس کمرے میں داخل ہونا ہے۔ کمرے کا دروازہ بند ہے اور آٹومیٹک قسم کا ہے۔ مہربانی فرما کر اسے کھلوا دیں۔"

"چلو بھئی۔ کھولو دروازہ۔" کریم نواز نے کلرک سے کہا۔

"م۔ میں کس طرح کھولوں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"ہمیں کیا پتا۔ اگر تم نہیں کھولو گے تو ہم اسے توڑ دیں گے۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

آخر کلرک آگے بڑھا اور دروازے پر تین بار دستک دی، پہلے دو مرتبہ آہستہ انداز میں تیسری مرتبہ زور سے ہاتھ مارے۔ دروازہ کھل گیا۔ ساتھ ہی اس نے کہا:

"دراصل دروازہ ریموٹ کنٹرول ہے۔"

"شکریہ!" کریم نواز نے منہ بنا کر کہا اور وہ اندر داخل ہوئے، اندر کوئی نہیں تھا۔ فرزانہ تیر کی طرح اس میز تک پہنچی۔ جس کے دوسری طرف مسٹر فیروزا بیٹھا ملا تھا۔ اس نے جلدی سے میز کی دراز کھولی، پھر نیچے رکھی ردی کی ٹوکری میں دیکھا اور ایک سفید کاغذ اٹھا لیا۔

اس کاغذ پر انگلیوں کے نشانات بنے ہوئے تھے۔

"یہ کیا۔ یہ تو وہی کاغذ ہے۔ جسے ہم نے رد کر دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ہمارے سامنے انگلیوں کے نشانات بنا کر ہمیں دے۔" محمود نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"ہاں! یہ وہی کاغذ ہے۔ لیکن ہم سے بھول ہوئی تھی۔ ہم غلط کاغذ لے گئے تھے۔ اصل کاغذ یہ ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"اصل کاغذ۔ کیا مطلب؟"

"پہلے مسٹر فیروزا دوسرے کمرے میں گیا اور ایک کاغذ پر انگلیوں کے نشانات بنا کر لے آیا۔ لیکن ہم نے اعتراض کیا کہ نشانات ہمارے سامنے بنائے جائیں۔ شاید اندر کوئی اور شخص

موجود تھا اور اس نے اس کاغذ پر نشانات اس سے بنوائے تھے۔ ہمارے اعتراض پر اس نے ایک اور بالکل ویسا ہی سفید کاغذ لیا اور ہمارے سامنے نشانات بنا دیے، پھر کاغذ ہماری طرف بڑھا دیا، لیکن۔ یہیں وہ چالاکی دکھا گیا۔ یعنی کاغذ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے مداریوں والا کام دکھایا تھا۔ کاغذ اس وقت بھی وہی نہیں دیا جس پر اندر والے کمرے میں نشانات بنائے گئے تھے۔"

"اوہ! ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"یہی وجہ ہے کہ نشانات جیکی کے ثابت نہیں ہو سکے۔"

"جیکی! مسٹر کریم نواز کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"کیوں۔ آپ کیوں چونکے۔ کیا آپ جیکی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟

"جیکی کی سرائے والے جیکی کے بارے میں میں ضرور جانتا ہوں:" وہ بولا۔

"اوہو اچھا۔ تو پھر بتائیے۔ وہ کہاں ملے گا:"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ جیکی ایک سرائے کا مالک تھا۔ اور پھر اس نے اپنی سرائے بیچ دی تھی، کیوں کہ اس کی سرائے کے بارے میں ان دنوں عجیب عجیب باتیں سنائی دینے لگی تھیں:"

"عجیب عجیب باتیں۔ کیا مطلب؟"

"پولیس نے یہ رائے قائم کر لی تھی کہ سرائے میں مجرم مارو لوگ رہائش رکھتے ہیں۔ اور اصل میں سرائے پر ان ہی لوگوں کا قبضہ ہے۔ جیکی ان سے اپنا حصہ وصول کرتا ہے، پھر پولیس نے اس پر چھاپا مارنے کا پروگرام بنایا، لیکن اس سے پہلے ہی جیکی سرائے فروخت کر کے غائب ہو گیا۔ اب میں نے آپ کے منہ سے اس کا نام سنا ہے:"

"جی ہاں۔ شکریہ۔ ہم بھی جیکی کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔ مسٹر فیروزا پر ہمیں جیکی کا شبہ ہوا تھا۔ ہم نے اپنا شبہ اس پر ظاہر بھی کر دیا تھا۔ اور اسی شبے کی بنا پر ہم نے اس سے انگلیوں کے نشانات طلب کیے تھے۔ اور نشانات دینے کے چکر میں اس نے ہم سے چال بازی کی جسے ہم دیر سے بھانپ سکے۔ تاہم اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اس کاغذ کو "تلف نہیں کیا۔ اب ہم اس کی مدد سے یہ جان سکیں گے کہ فیروزا ہی جیکی ہے یا نہیں:"

"لیکن۔ اس سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ابا جان کہاں ہیں، کیوں کہ ہوٹل کا گھیراؤ کرنے کے لیے انھوں نے ہی فون کیا تھا، لیکن وہ یہاں کہیں بھی نظر نہیں آ رہے:" محمود بولا۔

"اس بات پر تو ہمیں بھی حیرت ہے۔" کریم نواز نے جلدی سے کہا۔

"تو پھر ہم ہوٹل کے کمروں کا جائزہ لیں گے۔" فاروق نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ اس کمرے سے نکل کر آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک کمرے کے فرش پر انھیں سب انسپکٹر اکرام بے ہوش پڑا نظر آیا۔

٭

ڈبل اوہ

اکرام کو بے ہوش دیکھ کر ان کی سٹی گم ہو گئی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ مسٹر فیروزا انھیں جُل دے گیا۔ انھوں نے برآمدے کے دونوں طرف نظر دوڑائی اور پھر ہوٹل کی پچھلی سمت میں دوڑ پڑے۔ یہاں تک کہ پچھلے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ باہر نکل کر انھوں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا، لیکن مسٹر فیروزا کہیں بھی نظر نہ آیا اور نظر آتا بھی کیسے۔ اسے تو فرار ہونے کے لیے کافی وقت مل گیا تھا۔ چند سیکنڈ تک وہ سوچ میں گم رہے کہ کیا کریں، پھر کسی خیال کے آتے ہی جیپ کی طرف دوڑ پڑے۔ جلد ہی وہ جیپ میں بیٹھے شمال مغربی سمت میں اڑے جا رہے تھے۔ وہ بنگلے کے نزدیک پہنچ گئے، لیکن راستے میں مسٹر فیروزا کا کوئی سراغ نہ ملا۔ آخر انھوں نے جیپ کو پھر بنگلے کی طرف دوڑا دیا۔ ان کے خیال کے مطابق فیروزا انھیں چوٹ دے گیا تھا۔

بنگلہ بھی سنسان پڑا نظر آیا۔ گویا فیروزا اس طرف نہیں آیا تھا۔ اب اس کی تلاش فضول تھی، اس لیے انھوں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے سوچا۔ اس وقت تک ہوٹل کو گھیرے میں لیا جا چکا ہوگا، لہٰذا انھیں بھی وہاں پہنچ جانا چاہیے۔

وہ سڑک کے کنارے پہنچے اور شہر کی طرف مڑ گئے، لیکن ابھی دس منٹ بھی نہ چلے ہوں گے کہ انھیں سڑک کے کنارے ایک شخص کھڑا نظر آیا، انھوں نے کوئی خیال نہ کیا، کیوں کہ بس وغیرہ کے انتظار میں لوگ کھڑے رہا ہی کرتے ہیں۔ اور پھر ان کی جیپ اس شخص کے قریب سے گزر گئی۔ وہ کسی بت کی مانند کھڑا تھا۔ جیپ کے گزرنے پر بھی اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کے چہرے پر ان کی نظر پڑی تو انھیں ایک عجیب سا احساس ہوا۔ انھوں نے جیپ روک لی اور اسے واپس لوٹاتے چلے گئے، یہاں تک کہ اس شخص کے پاس پہنچ گئے۔ وہ دوسرا لمحہ شاید ان کی زندگی کا حیران کن ترین لمحہ تھا۔ ان کا منہ مارے حیرت، خوف اور پریشانی کے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ بلا کی رفتار سے جیپ سے نیچے اتر آئے، کیوں کہ سڑک کے کنارے صدر مملکت کھڑے تھے۔

انھوں نے پہلے تو بغور ان کی طرف دیکھا۔ کہ کہیں انھیں

دھوکا تو نہیں ہوا، لیکن وہ ہر پہلو سے صدر مملکت تھے، لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کے نزدیک رکنے پر اور جیپ سے اتر کر ان کی طرف بڑھنے پر بھی ان کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انسپکٹر جمشید کی حیرت کا کیا پوچھنا۔

"سر۔ آپ۔ یہاں؟" ان کے منہ سے نکلا۔

لیکن ان کے جسم میں اب بھی حرکت نہیں ہوئی، انھیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ گہری نیند میں ہوں، لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ کھڑے ہوئے تھے اور آنکھیں کھلی تھیں۔ خیر۔ کھڑے ہونا بھی اتنا عجیب نہیں تھا۔ کچھ لوگ سوتے میں بھی چلتے رہتے ہیں، لیکن ان کی آنکھیں ضرور بند ہوتی ہیں۔ جب کہ صدر صاحب کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ پلکیں بھی جھپکا رہے تھے:

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا سر؟" انھوں نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ اب بھی کچھ نہ بولے۔ انسپکٹر جمشید کو شدید خوف کا احساس ہوا۔ انھوں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر صدر صاحب کو بازو سے پکڑ کر جیپ کی طرف کھینچا۔ وہ ان کے ساتھ کھنچے آئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ انھیں جیپ میں بٹھا چکے تھے اور پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر شہر کی طرف اڑے جا رہے تھے۔

"سر۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے ـ کے لیے کچھ تو بولیے۔"
کوئی جواب نہ ملا۔ وہ بت بنے بیٹھے رہے۔ ان کی حیرت
میں اضافہ ہوتا رہا۔ آخر وہ ملٹری ہسپتال تک پہنچ گئے۔
انھوں نے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کو وہیں بلا لیا۔ صورت حال بتائی
تو اس کے بھی پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ فوراً ہی اسٹریچر
لایا گیا اور انھیں اندر لے جایا جانے لگا۔
"ہسپتال اب پوری طرح نگرانی میں رہے گا۔ اور صدر صاحب
کو جلد از جلد ہوش میں لانے کی کوشش کی جائے گی، کیوں کہ کل
گوالا کے صدر سے ان کی ملاقات طے ہے، ہوائی اڈے پر
استقبال بھی انھی کو کرنا ہے۔ اور اس پروگرام میں کوئی ردوبدل
نہیں ہو سکتا۔"
"آپ فکر نہ کریں۔ ہم انھیں بہت جلد ہوش میں لے آئیں
گے۔" اس نے کہا اور وہ باہر نکل کر ہوٹل فیروزا کی طرف بڑھے۔
ہوٹل فیروزا پوری طرح پولیس کے گھیرے میں نظر آیا۔
ایک حوالدار انھیں پہچان کر تیزی سے آگے بڑھا:
"آپ کہاں رہ گئے تھے سر؟"
"میں ذرا دوسری طرف اُلجھ گیا تھا۔ یہاں ہر طرح خیریت
تو ہے؟"
"آپ کے اسسٹنٹ اندر بے ہوش ملے ہیں۔ ڈاکٹر ان کا معائنہ

کر رہا ہے۔ دوسرے لوگ بھی اندر ہی ہیں۔ اور آپ کے
بچے بھی۔"
"او ہو اچھا۔ تو وہ بھی پہنچ گئے۔" انسپکٹر جمشید کے منہ
سے نکلا اور پھر وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھے۔ یہاں تک
کہ اس کمرے تک پہنچ گئے، جس میں اکرام کا معائنہ ہو رہا
تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی انھوں نے دیکھ لیا کہ اکرام کی
آنکھیں کھلی تھیں؛ تاہم وہ چھت میں گڑی ہوئی تھیں۔
"السلام علیکم۔" انھوں نے دبی آواز میں کہا۔
"او ہو۔ آپ آ گئے۔" محمود چہکا۔
"وعلیکم السلام۔" سب کے منہ سے نکلا۔
"ہاں بھئی۔ آ ہی گیا۔ اکرام۔ تمھارا کیا حال ہے؟"
اکرام نے انھیں کوئی جواب نہ دیا، اگرچہ کھلی آنکھوں کو
دیکھ کر انھوں نے یہی خیال کیا تھا کہ وہ پوری طرح ہوش
میں ہے۔
"کیا اکرام ہوش میں نہیں ہے؟" انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔
"جی نہیں۔ یہ ہوش میں ہوتے ہوئے بھی ہوش میں نہیں
ہیں۔"
"ہیں۔ نہیں!" وہ خوف زدہ انداز میں بولے۔
"آپ اتنے حیران کیوں دکھائی دے رہے ہیں ابا جان؟"

محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اور تم کیوں حیران ہو؟" انھوں نے اُلٹا سوال کر دیا۔

"اس لیے۔ اس لیے کہ انکل خان رحمان بھی اسی کیفیت سے دوچار ہیں۔"

"کیا؟" ان کے منہ سے چیخنے کے انداز میں نکلا۔

"جی ہاں! ہم نے انھیں ہسپتال داخل کروایا ہے۔"

"اوہ۔ اوہ۔" وہ بولے۔

"آپ تو ضرورت سے کچھ زیادہ حیران دکھائی دے رہے ہیں، خیر تو ہے؟"

"نہیں۔ خیریت نہیں ہے۔ اکرام کو بھی ہسپتال بھجوا دینا چاہیے۔ اس کے بعد ہمیں اس پورے ہوٹل کی بغور تلاشی لینی ہو گی۔"

ان کی ہدایات پر عمل کیا گیا، پھر پورے ہوٹل کی تلاشی لی گئی، لیکن کام کی کوئی چیز نہ ملی۔ آخر ہوٹل کو سیل کرا کے وہ ہسپتال کی طرف روانہ ہوئے؛

"ہاں بھئی۔ ذرا اپنی کہانی سنا دو۔ تم یہاں کس طرح پہنچے؟"

انھوں نے تفصیل کہہ سنائی، پھر انسپکٹر جمشید نے انھیں حالات سنائے، لیکن صدر صاحب والا ذکر گول کر گئے۔

"گویا اب ہمیں صدر صاحب کو تلاش کرنا ہے۔" محمود بڑبڑایا۔

"ہاں! اور اس کے لیے ہمیں پہلے انگلیوں کے ان نشانات کا معائنہ کروانا ہے۔ جو اس دوسرے کاغذ پر موجود ہیں۔" انھوں نے کہا۔

ہسپتال میں خان رحمان اور اکرام جوں کے توں نظر آئے، اس لیے وہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب وہ ریکارڈ سیکشن پہنچے۔ دوسرا کاغذ ان لوگوں کو دیا گیا:

"معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ نشانات جیکی کی انگلیوں کے نشانات سے ملتے ہیں یا نہیں۔"

"جی بہتر۔ آپ کو صرف چند منٹ انتظار کرنا ہو گا۔"

"کوئی بات نہیں۔"

چند منٹ بعد انچارج نے انھیں بتایا:

"یہ نشانات جیکی کی انگلیوں کے ہی ہیں۔"

"اوہ! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جیکی نے اپنی سرائے کسی کو فروخت نہیں کی تھی۔ بلکہ اس نے اپنا حلیہ تبدیل کر لیا تھا اور ساتھ ہی سرائے کو ہوٹل میں تبدیل کر دیا تھا، کیوں کہ پولیس ان دنوں جیکی پر زور شور سے شک کر رہی تھی۔ گویا اس نے پولیس سے محفوظ رہنے کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔"

"جی ہاں - نظر تو یہی آتا ہے - سوال یہ ہے کہ اب اسے صدر صاحب کو اغوا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کم از کم ابھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ صدر صاحب کو بھی اسی نے اغوا کیا ہے ، کیوں کہ ابھی تک انکل خان صاحب کی گاڑی سے ڈاکٹر تابانی کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں - ڈاکٹر تابانی جیکی کی سرائے میں رہا کرتا تھا - ادھر بنگلے سے ملنے والے نشانات اور خودکشی کرنے والے کی انگلیوں کے نشانات ایک پرانے جرائم پیشہ ابرار باچا کے ہیں - یہ ابرار باچا بھی جیکی کی سرائے میں رہتا تھا - ہر بات جیکی کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہی جیکی اب ہوٹل ہوشام کا مالک ہے - اور اس وقت ہوٹل سے فرار ہو کر غائب ہو چکا ہے - آخر یہ سب چکر کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

"یہ تو آپ ہی بتائیں گے کہ یہ سب کیا ہے - بظاہر تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ سارا چکر صدر مملکت کو اغوا کرنے کے لیے چلایا گیا ہے - اور اگر بات یہی ہے تو پھر یہ کہنا آسان ہو جاتا ہے کہ جیکی یا فیروزا کا تعلق ہمارے دشمن ملک سے ہے اور وہ دشمن ملک کا ایجنٹ ہے۔" فرزانہ کا لہجہ پُر زور تھا۔

"ہاں فرزانہ! تم نے درست نتیجہ نکالا - میں پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں۔"

"یہی تو ہماری مشکل ہے کہ آپ پہلے ہی درست نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"تو کیا تم چاہتے ہو ، میں غلط نتیجے پر پہنچا کروں۔" انھوں نے اسے گھورا۔

"نن - نہیں - ابا جان - بھلا میں یہ چاہ سکتا ہوں - لعنت ہے ایسا چاہنے پر۔" اس نے فوراً کہا اور وہ مسکرا کر رہ گئے۔

"اب سوال یہ ہے کہ ہم جیکی عرف فیروزا کو کس طرح تلاش کریں ، کیوں کہ صدر صاحب کے بارے میں ہم اس سے ہی معلوم کر سکتے ہیں۔" محمود بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں - صدر صاحب کے بارے میں تو تم مجھ سے بھی معلوم کر سکتے ہو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی - کیا مطلب؟" وہ چونک اٹھے۔

"آؤ میرے ساتھ۔" انھوں نے کہا۔

وہ انھیں جیپ میں بٹھا کر ملٹری ہسپتال پہنچے - اور پھر ایک کمرے میں داخل ہوئے - محمود ، فاروق اور فرزانہ زور سے اُچھلے - اندر صدر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔

"یہ - یہ کیا ابا جان - ہم تو اس خیال میں تھے کہ انھیں اغوا کر لیا گیا ہے۔" محمود حیرت زدہ انداز میں بولا۔

"ہاں! خیال غلط نہیں تھا - انھیں واقعی بنگلے سے اغوا

کر لیا گیا تھا، لیکن پھر یہ مجھے سڑک کے کنارے ملے۔ اور ان
کی بالکل وہی حالت تھی جو تم نے خان رحمان کی بتائی ہے یا ہم
نے اکرام کی دیکھی ہے۔"

"اوہ۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہوا ہے؟"

"ان پر یا تو کوئی دوا آزمائی گئی ہے یا پھر یہ ہپناٹزم
ہے۔"

"ہپناٹزم۔ یعنی مسمریزم۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں۔ بالکل۔ بجلی یا فیروز کو تو ہم بعد میں تلاش کرتے
رہیں گے۔ ہمارا اس وقت کا مسئلہ تو یہ ہے کہ صدر صاحب
کسی نہ کسی طرح اپنی اصلی حالت پر آ جائیں۔"

"یہ تو ڈاکٹر ہی [illegible] گے۔"

"ہاں، ٹھہرو۔ میں معلوم کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس وقت ڈاکٹروں
کی پوری [illegible] صدر صاحب کا معائنہ کر رہی تھی:

"کیوں ڈاکٹر صاحبان۔ کیا خیال ہے۔ صدرِ مملکت کل مہمان
صدر کا استقبال کر سکیں گے یا نہیں؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس وقت تک ہمیں ایک فی صد
بھی کامیابی نہیں ہوئی۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔ "یہ اطلاع صدر درجے خوفناک

تھی۔"

"کیوں نہ ہپناٹزم کے ماہر کی بھی خدمات حاصل کر لی جائیں۔"
فرزانہ بول پڑی۔

ڈاکٹر صاحبان اس کی بات سن کر چونک اٹھے:

"اوہ ہاں! اس کی واقعی ضرورت ہے، کیوں کہ اگر یہ
مسمریزم کے زیرِ اثر ہیں تو پھر ہماری ساری تدابیر رائیگاں جائیں
گی۔"

"ہوں۔ میں اپنے ایک دوست کو فون کرتا ہوں۔ وہ مسمریزم
کے بہت بڑے ماہر ہیں۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید فون کی طرف بڑھ گئے۔ بیس منٹ بعد
ان کے دوست پروفیسر جیلانی آ پہنچے۔ انھیں ساری بات
بتائی گئی۔ آخر انھوں نے صدر صاحب کا معائنہ کیا، آنکھوں کی
پتلیاں وغیرہ دیکھیں۔ اور بھی کئی طرح سے معائنہ کیا، آخر سیدھے
ہوتے ہوئے بولے:

"میرا دعویٰ ہے۔ یہ ہپناٹزم کے زیرِ اثر نہیں ہیں۔ کسی
دوا کا اثر ضرور ہو سکتا ہے۔"

"شکریہ۔ اگر یہ کسی دوا کا اثر ہے۔ تو وہ ہم خود معلوم کر
لیں گے۔" ایک ڈاکٹر بولا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ کل

سے پہلے پہلے ہمیں انھیں ہوش میں لانا ہے۔"

"ہم سر توڑ کوشش کریں گے۔ اطمینان رکھیے۔"

"آؤ بھئی چلیں۔ اب یہاں ہمارا کوئی کام نہیں۔ کیوں نہ
یہ وقت فیروزا کی تلاش میں صرف کریں، کیوں کہ اگر ہم اسے
پکڑ لیتے ہیں تو بھی اس دوا کا توڑ معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

وہ ہسپتال سے باہر نکل آئے۔

"سوال یہ ہے کہ جیکی یا فیروزا کو کہاں تلاش کیا جائے؟"

"ایک بات مجھے شروع سے چبھ رہی ہے۔ اور وہ یہ کہ
فیروزا ہوٹل سے نکلتے ہی غائب ہو گیا تھا۔ آخر کیسے؟"

"ہو سکتا ہے، اس نے ہوٹل کے نزدیک ہی اپنا کوئی اور
ٹھکانا بنا رکھا ہو۔" محمود نے خیال ظاہر کیا۔

"یا پھر ہوٹل کے پچھلی طرف کوئی گاڑی اس کے لیے ہر وقت
تیار کھڑی رہتی ہو۔ اور وہ باہر نکلتے ہی اس میں سوار ہو گیا ہو،
آپ تو یوں بھی ان کی واپسی کا انتظار کرتے رہے تھے۔" فرزانہ
نے کہا۔

"اور ایک صورت اور بھی ہو سکتی ہے۔" فاروق نے مسکرا
کر کہا۔

"اور وہ کیا؟"

"یہ کہ وہ ہوٹل سے باہر نکلا ہی نہ ہو۔ بلکہ ہوٹل میں ہی

کہیں رک گیا ہو اور پھر اپنا میک اپ ختم کر کے دوسرے لوگوں
میں شامل ہو کر باہر نکل گیا ہو۔"

"اوہ۔ اوہ۔" ان کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"یہ آپ نے ڈبل اوہ کس لیے منہ سے نکالا؟"

"اس لیے کہ فاروق کی بات مجھے نسبتاً زیادہ قابلِ عمل نظر
آئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مجھے ایک بات اور یاد آ
رہی ہے۔ یہ کہ کاؤنٹر کلرک اس کا خاص آدمی ہے۔ کیوں
نہ ہم کاؤنٹر کلرک کو ٹٹولیں۔"

"بات دل کو لگتی ہے۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ میری بھی کوئی بات تمھارے دل
کو لگی۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"مجبوری ہے۔ کوشش تو بہت کی تھی کہ دل کو نہ لگے۔"

"ہمیں پہلے کلرک کے گھر کا پتا حاصل کرنا ہو گا۔ کریم نواز صاحب
نے تمام ریکارڈ قبضے میں لے لیا ہو گا۔ پتا ہم ان سے معلوم
کر سکتے ہیں۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ ایک دروازے پر دستک دے رہے
تھے۔ ایک منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک بوڑھے آدمی کا چہرہ
نظر آیا۔

"مسٹر چانگ یہیں رہتے ہیں نا؟"

"جی۔ جی ہاں۔"

"ہمیں ان سے ملنا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں انھیں اطلاع کرتا ہوں۔" یہ کہ کر بوڑھا مڑنے لگا۔

"ایک منٹ بڑے میاں۔" انسپکٹر جمشید نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ وہ ان کی طرف مڑا۔

"ان کے کوئی اور ملاقاتی تو نہیں آئے ہوئے؟"

"جی ہاں، ایک دوست آئے ہوئے تو ہیں۔"

"شکریہ۔ تب آپ انھیں اطلاع نہ دیں۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"ہم آپ کے ساتھ ہی چلیں گے۔" یہ کہ کر انھوں نے قدم اندر رکھ دیا۔

"میں سمجھا نہیں جناب۔ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

"ہم اچانک ان کے سامنے جانا چاہتے ہیں اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ انھیں اطلاع نہ دی جائے۔"

"جی بہتر، لیکن کیا وہ ناراض نہیں ہوں گے؟"

"اس کا انتظام ہم کیے دیتے ہیں، وہ آپ پر ہرگز نہیں بگڑ سکیں گے۔"

"لل۔ کیسے؟" بوڑھے نے حیران ہو کر کہا۔

"آپ ڈریے گا نہیں۔" یہ کہ کر انھوں نے جیب سے پستول نکال لیا۔ بوڑھے کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

"یہ۔ یہ کیا؟"

"یہ آپ کو ناراضی سے بچانے کے لیے نکالا گیا ہے۔ آپ کہ دیجیے گا۔ ہم لوگ پستول کے زور پر اندر داخل ہوئے ہیں۔"

"وہ۔ وہ تو خیر ٹھیک ہے، لیکن جناب۔ آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"اس ملک کی بھلائی۔"

"میں سمجھا نہیں۔" اس نے کہا۔

"پہلے یہ بتائیے۔ اندر چھاگی صاحب کا جو دوست موجود ہے، اس کا نام کیا ہے؟"

"میں ان کا نام نہیں جانتا۔ ویسے وہ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ آتا ضرور ہے۔"

"چلو حلیہ ہی بتا دو۔"

"لمبا قد۔ بڑی مونچھیں، نیلی آنکھیں۔"

ان کے چہرے پر حیرت دوڑ گئی۔ دل دھڑک اٹھے۔ کیوں کہ یہ حلیہ مسٹر جیکی کا تھا۔

ناکامیوں کا دن

"بھئی واہ — تب تو مزا آ گیا — ہمیں ان ہی سے تو ملنا ہے۔"

"جی — کیا مطلب — ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ چھاگی صاحب سے ملنا ہے۔"

"دراصل چھاگی صاحب سے مل کر ان صاحب کا ہی پتا کرنا تھا۔"

"آپ کی باتیں میرے پلے نہیں پڑ رہیں۔"

"یہ اچھا ہی ہے — آئیے اندر چلیں۔"

وہ ان کے آگے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے — اور پھر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے — اس میں سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں — انھوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بوڑھے کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا — اور قدم بھی روک لیے — اسی وقت کمرے سے چھاگی کی آواز ابھری:

"چلیے خیر — ہم پھر بھی کامیاب رہے — ہوٹل ہاتھ سے گیا

تو کیا ہے۔"

"حیرت ہے — تمھارے ملازم نے اب تک آ کر نہیں بتایا کہ کون آیا ہے۔"

"اوہ ہاں — میں تو بھول ہی گیا — بابا رحمو — تم کہاں رہ گئے، باہر کون ہے؟"

اب انسپکٹر جمشید آگے بڑھے اور [illegible] کمرے میں داخل ہو گئے:

"باہر ہم تھے جناب۔" وہ بولے۔

چھاگی اور فیروزا اچھل کر کھڑے ہو گئے — فیروزا کا حلیہ اس وقت کچھ مختلف نظر آیا — گویا اس نے تبدیلی کر لی تھی یا میک اپ ختم کر دیا تھا — اس وقت اگر اکرام ان کے ساتھ ہوتا تو وہ فوراً ہی بتا دیتا کہ مسٹر چیکی اب کس حلیے میں ہیں۔

"آپ — آپ — یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔"

"ہمیں دیکھ رہے ہیں — شاید آپ لوگوں کا خیال تھا — ہم آپ کو نہیں پکڑ سکتے، لیکن دیکھ لیں — پکڑ ہی لیا آخر — ویسے مسٹر چیکی، آپ ہیں بہت چالاک۔" انسپکٹر جمشید نے شوخ انداز میں کہا۔

"ارے نہیں صاحب — میں چیکی نہیں ہوں — میرا نام فیروزا ہے۔"

"تب پھر آپ کا چہرہ وہ کیوں نہیں نظر آ رہا جو ہوٹل میں

نظر آ رہا ہے۔"

"میرا اصلی چہرہ یہی ہے۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ ہم آپ کو جعلی ثابت کر چکے ہیں۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جو کاغذ آپ نے ہمیں دیا تھا۔ اس پر آپ کی انگلیوں کے نشانات نہیں تھے۔ بلکہ دوسرے کاغذ پر تھے اور وہ کاغذ آپ نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ ہم آپ کی چال کو ذرا دیر سے سمجھے۔ ہم پھر ہوٹل پہنچے تھے اور وہ کاغذ ردی کی ٹوکری سے اٹھا لائے تھے۔ اس کی رو سے آپ صرف اور صرف جعلی ہیں۔ جو ایک سرائے کا مالک تھا اور اس سرائے میں ڈاکٹر تابانی اور ابرار باچا جیسے لوگ رہا کرتے تھے اور اپنے شکار گھیر کر سرائے میں لاتے تھے۔ گویا آپ ان شکاریوں کو اپنی سرائے میں پناہ دیتے تھے اور وہ آپ کو اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ دیا کرتے تھے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔" محمود کہتا چلا گیا۔

"پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔"

"آئے بھی کیسے۔ جب کہ آپ سمجھنا ہی نہ چاہیں۔ خیر

آپ دونوں کو محکمہ سراغ رسانی کے دفتر تک چلنا ہے۔ اٹھ کر کھڑے ہو جائیے۔"

"ہمارا جرم کیا ہے جناب؟"

"تو ابھی آپ لوگوں کو اپنا جرم معلوم کرنے کی بھی خواہش ہے۔ کمال ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہم امن پسند شہری ہیں۔"

"ارے بھئی۔ ہوٹل بوادام کی تلاشی کے بعد تم یہ دعویٰ کرتے اچھے نہیں لگتے۔" انسپکٹر جمشید پھر مسکرائے۔

"کیوں۔ وہاں سے آپ کو ایسی کیا چیز مل گئی۔" فیروزا نے جل کر کہا۔

"ایک آلہ۔ جس سے دُور دراز کے فاصلوں پر بات کی جا سکتی ہے۔ اور مزے کی بات یہ کہ تم تو ہمارے دشمن ملک شارجستان سے بات چیت کرتے رہے ہو۔ اور وہ آلہ بھی تمہیں انہی سے ملا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔" انسپکٹر جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" فیروزا اور چھاگی کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ ان کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

"لہٰذا اب تم دونوں کو میرے ساتھ ہیڈ کوارٹر تک چلنا ہوگا۔ اگر تم نے فوراً ہی یہ بتا دیا کہ سعدی محلات کس طرح

اپنی اصلی حالت پر آئیں گے، تب تو تم کرۂ امتحان سے بچ جاؤ گے، بصورتِ دیگر کرۂ امتحان کا مزا چکھنا ہو گا۔ ہاتھ اوپر اُٹھا دو۔ اور گھر سے باہر چلو۔ تم تینوں ان پر نظر رکھو گے۔ خبردار، یہ اپنے ہاتھ جیبوں کی طرف نہ لے جانے پائیں، کیوں کہ ہو سکتا ہے، ان کی جیبوں میں خودکشی کا سامان موجود ہو۔"

"خودکشی کا سامان" محمود کے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔ بالکل اسی طرح۔ جس طرح ابرار بابا نے خودکشی کی ہے۔"

"اوہ ہاں۔ واقعی۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"تم نے سنا نہیں۔ اگر اپنے پیروں پر چل کر جانا پسند نہیں تو مجھے دوسری طرح لے جانا بھی آتا ہے۔"

دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بوڑھا ملازم ایک طرف کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ آخر وہ ان دونوں کو گھر سے باہر نکال لائے۔ سڑک کے کنارے تک انھیں پیدل ہی لے جانا تھا، چنانچہ انسپکٹر جمشید ان کے بالکل پیچھے اور محمود، فاروق اور فرزانہ دائیں بائیں چلنے لگے۔ اسی وقت سامنے سے ایک اندھا بھکاری آتا نظر آیا۔ وہ لاٹھی ٹیکتا بالکل ان دونوں کی سیدھ میں چلا آ رہا تھا۔

"محمود۔ بڑے میاں کو ایک طرف کر دو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

محمود آگے بڑھا اور لاٹھی پکڑ کر اندھے کو گلی کے ایک طرف کر دیا، لیکن اچانک اس کی لاٹھی پھسل گئی اور وہ دھڑام سے گرا۔ فیروزا اور چھاگی اس کی پلیٹ میں آتے آتے بال بال بچے اور گرتے گرتے بچے۔ محمود نے جلدی سے بوڑھے کو کھڑا کر دیا اور وہ بھلا کرے کہتا آگے نکل گیا۔

ادھر فیروزا اور چھاگی اُٹھنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن ان سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" انسپکٹر جمشید جھلا اُٹھے۔

"شاید یہ کوئی چال چلنے کے موڈ میں ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"مشکل ہے۔ ہم ان کی چال ہرگز نہیں چلنے دیں گے۔" فرزانہ نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

اچانک وہ دونوں پھر گرے اور ساکت ہو گئے۔

"ہوشیار۔ یہ واقعی چال چلنے کے موڈ میں ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"دیکھو بھئی۔ اگر چال چلنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر کسی وقت چل لینا۔ اس وقت تو ہمارے ساتھ چلے چلو۔" فاروق نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

لیکن دونوں اپنی جگہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

"اوہو۔ یہ تو بالکل ساکت ہیں۔" محمود بولا۔

انسپکٹر جمشید چونک کر ان کی طرف چلے۔ اور پھر جھک کر انہیں چھوا، دوسرے ہی لمحے وہ چونک کر سیدھے ہو گئے، پھر چلا اٹھے۔

"ارے ارے۔ دوڑو۔ اس اندھے کو پکڑو۔ وہ اندھا نہیں تھا۔"

"جی۔ وہ اندھا نہیں تھا۔ تو ہمیں کیا۔ ہم اسے کیوں پکڑیں؟" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

جواب دینے کی بجائے انسپکٹر جمشید اس طرف دوڑ پڑے جس طرف اندھا بھکاری گیا تھا۔ اب تو محمود اور فاروق بھی دوڑ پڑے۔ ساتھ ہی محمود نے چیخ کر کہا،

"فرزانہ تم ان کے پاس ٹھہرو۔"

پانچ منٹ بعد تینوں منہ لٹکائے واپس آ گئے۔ اب وہاں دوسرے لوگ بھی جمع ہونے لگے تھے۔

"گلیوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ نہ جانے وہ کس گلی سے نکل گیا۔" انسپکٹر جمشید نے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے۔ ہم ایک بار پھر چوٹ کھا گئے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"ہاں! یہ دونوں مر چکے ہیں۔ ان کے جسموں میں زہریلی سوئیاں پیوست کر دی گئی ہیں اور یہ کام اس اندھے بھکاری کا ہے۔"

پولیس کو فون کیا گیا اور اس کے وہاں پہنچنے کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ پہلے ایک چکر ہسپتالوں کا لگایا، ابھی تک ڈاکٹروں کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ خبر بھی ان کے لیے انتہائی خوف ناک تھی۔

"صبح تک اگر ڈاکٹر صاحبان کو کوئی کامیابی نہ ہوئی تو کیا ہوگا ابا جان؟" فرزانہ نے پریشان آواز میں کہا۔

"وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہوگا۔" انھوں نے جواب دیا۔

"ہوں۔ یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ پھر اب کیا کرنا ہے؟"

"ہم نے جڑ کے دو آدمیوں کو ڈھونڈ لیا تھا، لیکن ان دونوں کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔ اب تو لے دے کر ہمیں اس اندھے بھکاری کی ضرورت ہے۔ وہی ہمارے لیے کام کا آدمی ہو سکتا ہے۔ ویسے اب یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ اس سازش کی جڑیں بہت گہری ہیں اور منصوبہ خوب سوچ سمجھ

کر بنایا گیا ہے۔ گویا اس کی تیاری بہت پہلے کر لی گئی
تھی۔ ورنہ خان رحمان کی یہ حالت نہ ہوتی۔ انھیں اس لیے
زوا کا شکار بنایا گیا تاکہ ہم ان کے چکر میں پڑ کر رہ
جائیں، لیکن وہ لوگ ابھی یہ نہیں جانتے کہ جب دین، ملک
اور قوم کا معاملہ ہو تو ہم خود کو اور اپنے عزیزوں کو بالکل
بھول جاتے ہیں۔ اب تم اگر تھک گئے ہو تو گھر جا سکتے ہو،
میں تو یہ رات شہر کی سڑکوں پر گزاروں گا۔"

"تھکنے کا کیا کام۔ ہم بھی آپ کے ساتھ سڑکیں ماپیں
گے۔ کیا خبر کسی سڑک پر اندھے بھکاری سے ملاقات ہو جائے۔"

"اب وہ اندھا کہاں رہا ہو گا۔ آنکھوں والا بن چکا ہو
گا۔ اندھا تو وہ ان دونوں سے ٹکرانے کے لیے بنا تھا۔" فرزانہ
نے منہ بنایا۔

"ہاں بالکل۔ خیر۔ میں ایک چکر شمال مغربی سڑک کا لگانے
کا ارادہ رکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے جیپ کا رُخ موڑ دیا۔
اب وہ پھر اس بنگلے کی طرف چلے جا رہے تھے۔

"کیا آپ یہ خیال کر رہے ہیں کہ مجرموں میں سے کوئی اب
تک بنگلے میں موجود ہو گا۔" فرزانہ بولی۔

"نہیں، لیکن ایک بات بہت عجیب ہے۔" وہ مسکرائے۔

"اور وہ کیا؟" محمود نے جلدی سے کہا۔

"صدر صاحب کا بنگلہ اسی طرف ہے، بنگلے سے ہی انھیں
اغوا کیا گیا تھا۔ اسی سڑک پر وہ مجھے ملے تھے۔ کیا اس کا
یہ مطلب نہیں کہ اغوا کرنے کے بعد انھیں کہیں نزدیک ہی
رکھا گیا تھا۔ صرف اسی صورت میں وہ انھیں سڑک کے کنارے
کھڑا کر سکتے تھے۔"

"اوہ! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" فاروق نے پُرجوش انداز میں
کہا۔

"لیکن ابا جان۔ رات ہو چکی ہے۔ ہم وہ [illegible] کس طرح
تلاش کر سکتے ہیں۔ دن کا وقت ہوتا تو اور بات تھی۔" فرزانہ
نے اعتراض کیا۔

"غلط۔ دن کے وقت اس [illegible] کو تلاش کرنا آسان نہ ہوتا،
اب ہم آسانی سے تلاش کر لیں گے، کیوں کہ جرائم پیشہ
لوگ رات کو جاگتے ہیں۔ دن میں سوتے ہیں۔" انھوں نے
کہا۔

آخر وہ بنگلے کے قریب سڑک تک پہنچ گئے۔ ہر طرف
تاریکی کا راج تھا۔

"فاروق! ایسے میں کسی [illegible] پر چڑھ سکو گے؟"

"جی۔ درخت پر۔ لیکن ابا جان درخت پر چڑھنے کی کیا
ضرورت پڑ گئی؟"

"یہ دیکھنا ہے کہ روشنی کس گھر میں ہو رہی ہے؟"

"لیکن روشنی تو کسی بھی گھر میں ہو سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ان مجرموں کے اڈے میں ہی روشنی ہو رہی ہو۔"

"یہاں گھر ہیں ہی کتنے۔ گنتی کے تو چند گھر ہیں۔ اور مجرموں کو یہ منصوبہ بہت سوچ سمجھ کر بنایا گیا تھا، اس لیے ضرور انھوں نے پہلے سے یہاں ایک مکان حاصل کر لیا ہو گا۔ بس ہمیں اسی مکان کی تلاش ہے۔"

"بہت بہتر۔ میں چڑھ جاتا ہوں۔ اگر کسی کیڑے سے ملاقات ہو گئی اور اس نے مجھے کاٹ کھایا تو میرے لیے دعائے مغفرت کرتے رہا کیجیے گا۔" اس نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"ہاں ہاں! تم فکر نہ کرو۔ اس قدر دعائے مغفرت کریں گے کہ یاد ہی رکھو گے۔" محمود نے طنزیہ کہا۔

فاروق تیزی سے ایک درخت کی طرف بڑھا اور چڑھنے لگا۔ درخت کافی اونچا تھا۔ وہ بلندی پر پہنچ کر رک گیا اور چاروں طرف کا جائزہ لیا، پھر وہیں سے بولا:

"صرف تین مکان روشن ہیں۔ باقی اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔"

"ان کی سمتوں کا اندازہ کر لو۔ شاید ہمیں ان تینوں کو چیک کرنا ہو گا۔"

"یہ میں کر چکا ہوں۔"

"تو پھر نیچے آ جاؤ۔" انھوں نے کہا۔

اب وہ اس سمت میں چلے جس سمت میں روشن مکان نظر آئے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مکان کے قریب پہنچ گئے، دبے پاؤں اس کے نزدیک پہنچے اور کان دروازے سے لگا دیے۔ لیکن اندر کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ شاید مکان میں رہنے والے روشنی میں سونے کے عادی تھے۔ اب وہ دوسرے مکان کی طرف روانہ ہوئے اور ناہموار راستا عبور کر کے وہاں تک پہنچے۔ اس مکان سے بھی انھیں کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

"شاید آج کا دن ناکامیوں کا دن ہے۔" فاروق بڑبڑایا۔

"پروا نہ کرو۔ ناکامیوں سے گھبرانے والے ہم نہیں ہیں۔" محمود مسکرایا۔

جوں ہی تیسرے مکان کے دروازے سے انھوں نے کان لگائے، ایک کمزور سی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ کوئی کہہ رہا تھا:

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ صبح پتا چلے گا۔"

"لیکن ابھی تک کامیابی ہمارے قدم چوم رہی ہے۔"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں، لیکن مشکل یہ ہے

ہمارا مقابلہ انسپکٹر جمشید سے ہے"۔

"انسپکٹر جمشید بھی ہمارے مقابلے میں کچھ نہیں کر سکا۔ اس کی دال نہیں گل سکی ۔ یہ کیس اس کی زندگی کا ناکام ترین کیس ثابت ہو گا"۔

"باس نہ جانے کہاں ہے۔ ہمیں تو یہ باس سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم اس کی ہدایات پر عمل کر رہے ہیں، لیکن اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ اس وقت تک ہمارے تین آدمی مارے جا چکے ہیں۔ اگر ہم بھی پھنس گئے تو کیا وہ ہماری مدد کرے گا ۔ ہرگز نہیں۔ اسے بھلا اس کی کیا پروا ہو سکتی ہے کہ ہم پر کیا گزرتی ہے"۔

"یہ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ کہ اپنی حفاظت خود کرنا ہو گی۔ وہ اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کرے گا۔ وہ تو صرف کام لے گا اور معاوضہ دے گا۔ پولیس سے بچانا اس کا کام نہیں ہو گا۔ جب اس نے یہ وضاحت پہلے ہی کر دی تھی تو پھر شکایت کیسی"۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے"۔

تھوڑی دیر کے لیے اندر خاموشی چھا گئی، پھر ایک بولا:

"چال چلو بھئی۔ چال۔ رک کیوں گئے"۔

"میں سوچ رہا ہوں۔ اس سارے منصوبے سے باس کا

مقصد کیا ہے"۔

"یہ ہمارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ لو میں نے پتا پھینک دیا"۔

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ انسپکٹر جمشید نے مایوسانہ انداز میں ان کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، یہ تو کچھ بھی نہ ہوا، پھر انہیں اشارے سے دور لے آئے:

"صاف ظاہر ہے، باس ان میں نہیں ہے، لہٰذا یہ لوگ ہمارے لیے کام کے ثابت نہیں ہو سکتے"۔

"تب پھر" فرزانہ بولی۔

"باس کے بارے میں انہیں کچھ معلوم بھی نہیں ہے۔ لہٰذا ہم وقت کیوں ضائع کریں۔ آؤ"۔

"جی کیا مطلب۔ کیا آپ انہیں گرفتار نہیں کریں گے"۔

"بعد میں پھر گرفتار کر لیں گے۔ یہ بھاگ کر کہاں جائیں گے"۔

وہ مکان سے دور ہونے لگے۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید مڑ مڑ کر دیکھتے بھی جا رہے تھے۔ اچانک وہ رک گئے اور سرگوشی کے انداز میں بولے:

"بس۔ یہیں ٹھہر جاؤ۔ اس درخت کی اوٹ میں"۔

"کیوں۔ اب کیا ہوا؟"

"چال پہ چال" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"چال پہ چال ۔ ہم سمجھے نہیں۔" محمود حیران ہو کر بولا۔

"تم نے دھیان نہیں دیا۔ جو جملے انھوں نے بولے وہ کچھ رٹے رٹائے سے لگ رہے تھے جیسے انھیں پہلے سے سکھائے گئے ہوں کہ تمھیں یہ جملے بولنے ہیں اور میں نے مکان کی چھت پر ایک سر بھی اُبھرتے دیکھا ہے۔ گویا وہ جائزہ لے رہے ہیں کہ ہم لوٹ چکے ہیں یا نہیں۔"

"اُف ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں آؤ ۔ واپس چلیں ۔ اب وہ ہم پر ہنس رہے ہوں گے۔" انھوں نے سرد آواز میں کہا۔

وہ دبے پاؤں چلتے پھر مکان تک آئے اور کان لگا دیئے، ان میں سے ایک ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا:

"کمال کر دیا باس ۔ آپ بھی پہلے سے سارا کام کرنے کے ماہر ہیں اور اندازے لگانے میں تو آپ کا جواب ہی نہیں، یعنی آپ نے یہ تک اندازہ لگا لیا تھا کہ انسپکٹر جمشید اور ان کے بچے یہاں تک ضرور پہنچیں گے۔"

"ہاں! میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔" کھُردری آواز سنائی دی۔

"اس کا مطلب ہے ۔ انسپکٹر جمشید مکمل طور پر ناکام رہے گا"

"ہاں! میں نے پورے چار ماہ تک اس منصوبے کی تیاری

کی ہے اور اس کے ہر پہلو کا جائزہ لیا ہے۔ انسپکٹر جمشید کل کیا کرے گا ۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے۔"

"جی ۔ کیا مطلب ۔ یہ آپ کو کس طرح معلوم ہے؟"

"بس ۔ میں دراصل اس کی چالوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں ۔ کل کا دن اس کی شکست کا عجیب ترین دن ہو گا ۔ جس کام کو وہ اپنی بہت بڑی کامیابی خیال کر رہا ہو گا، وہ اس کی سب سے بڑی ناکامی ہو گی اور کل کے دن یہ ملک گوانا کے صدر کی نظروں میں اس حد تک ذلیل ہو جائے گا کہ وہ پھر کبھی اس ملک کے کسی سربراہ سے بات کرنے پر تیار نہیں ہو گا اور یہی میری حکومت کا منشا ہے۔ اسی لیے میری حکومت نے مجھے یہ کام سونپا ہے۔"

"آخر کل کیا ہو گا ۔ کچھ ہمیں بھی تو بتایئے۔"

"افسوس! یہ بات تمھیں نہیں بتائی جا سکتی۔" کھُردری آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

اب ان کی بے چینی اپنی حدود کو چھو رہی تھی۔ بے آواز انداز میں انھوں نے اپنے والد کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مکان کے گرد ایک چکر لگایا، لیکن چھت پر پہنچنے کا کوئی ذریعہ نظر نہ آیا ۔ آخر مجبور ہو کر وہ پھر اس کے دروازے پر آئے

ایک لمحے کے لیے انھوں نے سوچا اور پھر دروازے پر دستک دے ڈالی ۔

اندر یک دم خاموشی چھا گئی ۔ یوں لگا جیسے موت کا سناٹا اندر طاری ہو گیا ہو ، ایک منٹ بعد کھردری آواز ابھری :

"کک ۔ کون ؟"

"خادم کو انسپکٹر جمشید کہتے ہیں ۔" انھوں نے شوخ آواز میں کہا ۔

اندر ایک بار پھر موت کی خاموشی چھا گئی ۔ آخر انسپکٹر جمشید نے پھر دستک دی :

"لیکن تم لوگ تو واپس چلے گئے تھے ۔" کھردری آواز میں حیرت شامل ہو گئی ۔

"تمھیں خوش کرنے کے لیے ذرا دیر کے لیے چلے گئے تھے ۔ ورنہ ہمیں رٹے رٹائے جملے جھاڑنے کا سلیقہ ہے ۔"

"اوہ !" اس کے منھ سے نکلا ۔

"اب کیا خیال ہے ۔ دروازہ کھول رہے ہو یا میں توڑ دوں ۔"

"نہیں ۔ توڑنے کی تکلیف نہ کریں ۔ میں دروازہ کھول رہا ہوں ۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی قدموں کی آواز سنائی دی :

"ہوشیار ۔ وہ پھر کوئی چال چل سکتا ہے ۔" انسپکٹر جمشید نے سرگوشی کی ۔

پھر وہ دائیں بائیں ہٹ گئے ۔ انسپکٹر جمشید نے پستول کا رخ دروازے کی طرف کر دیا ۔ آخر دروازہ کھلا اور ایک شخص کی صورت نظر آئی :

"اندر تشریف لے آیئے جناب ۔" اس نے کہا ۔ یہ آواز کھردری نہیں تھی ۔

وہ آگے بڑھے ۔ فوراً ہی ان کے قدموں کے پاس کوئی چیز آ کر گری ۔ ایک ہولناک دھماکا ہوا اور وہ تیز اثر والے دھوئیں میں چھپ گئے ، پھر ان کے ذہن تاریکیوں میں ڈوبتے چلے گئے ۔

واقعی بہت چالاک ہے۔"

"کم از کم آپ یہ تو بتا ہی سکتے ہیں کہ کل آپ کا کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں! میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ بس تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو۔"

"یہ تو ہمارے لیے کوئی نیا کام نہیں ہے۔" فاروق بولا۔

"پہلے تو ہم اس مکان کا جائزہ لے لیں۔ یہاں سے فرار ہوتے وقت کہیں وہ کوئی کام کی چیز نہ چھوڑ گئے ہوں۔"

"اس جیسے ذہین آدمی سے یہ امید کیسے کی جا سکتی ہے؟"

"یہاں کم از کم ایک بات امید کے خلاف ہو چکی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم اس کے پروگرام کے مطابق صاف گفتگو سن کر یہاں سے نہیں گئے تھے۔ بلکہ میں نے ان کی چال بھانپ لی تھی۔ اور مجرم کو دھوئیں کا بم مار کر اپنا راستہ صاف کرنا پڑا۔ گویا انہیں فرار ہونے کی اچانک ضرورت پیش آئی۔ یہ ان کے پروگرام میں شامل نہیں تھا، اس لیے ہو سکتا ہے، جلدی میں وہ ہمارے مطلب کی کوئی چیز چھوڑ گئے ہوں۔"

"ہوں۔ آپ کا خیال بھی ٹھیک ہے۔ تو پھر چلیے دیکھ لیتے ہیں۔"

یہ میرے لیے ہے

انہیں ہوش آیا تو اسی مکان کے دروازے پر پڑے تھے۔ مجرم اور اس کے ساتھی غائب تھے۔ ہوش سب سے پہلے انسپکٹر جمشید کو آیا تھا، پھر وہ باری باری ہوش میں آتے چلے گئے۔

"مجرم ہمیں ایک بار پھر چوٹ دے گیا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"شاید وہ چوٹ پر چوٹ دینے کا بہت ماہر ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اور ابھی تو اس کا اعلان یہ ہے کہ آپ اس کے منصوبے کے مطابق کل ایک قدم اٹھائیں گے۔ اور وہ قدم بھی خود ہمارے خلاف ہو گا۔" محمود نے فکرمندانہ انداز میں کہا۔

"ہاں! اس کا دعویٰ یہی ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن ابا جان! آپ کا خیال کیا ہے؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ بات ماننا ہو گی کہ مجرم

وہ مکان میں داخل ہوئے اور ایک ایک چیز کا جائزہ
لینے لگے۔ ضروریاتِ زندگی کی عام چیزوں کے علاوہ یہاں
کچھ موجود نہیں تھا۔ ایک آتش دان پر دوا کی چار ایک جیسی
شیشیاں رکھی تھیں۔ یہ انجکشن تھے۔ انھوں نے ان کی طرف
کوئی توجہ نہ دی۔

"افسوس! یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ واقعی بہت چالاک
ہے۔" محمود بڑبڑایا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ اب میں اس کے پروگرام کے مطابق
ہی عمل کروں گا۔" انسپکٹر جمشید سوچ میں گم لہجے میں بولے۔

"دوا کے ان چار انجکشنوں کی یہاں موجودگی سمجھ میں
نہیں آئی۔" فرزانہ نے سرسری انداز میں کہا۔

"نہ سمجھ میں آنے والی کون سی بات ہے۔ جبھی ان
میں سے کوئی بیمار ہوگا۔" فاروق نے کہا۔

"میرا خیال ہے۔ انھیں چیک کر ہی لینا چاہیے۔ اس
وقت تک تین آدمیوں کو موت کے گھاٹ بھی تو اُترنا پڑا
ہے اور وہ زہریلی سوئیوں کے ذریعے مرے ہیں۔ کہیں ان
پر لگا ہوا زہر ان شیشیوں میں تو موجود نہیں۔" محمود بولا۔

"ہاں! اس کا امکان ہے۔ خیر۔ میں انھیں اٹھا لیتا ہوں۔"
انسپکٹر جمشید نے کہا۔ اور چاروں شیشیاں جیب میں ڈال لیں۔

اب وہ پھر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر پہنچ کر
انسپکٹر جمشید نے چاروں شیشیاں لیبارٹری میں دیں اور
گھر پہنچے۔ ہسپتالوں میں فون کر کے صدر صاحب، خان
رحمان اور اکرام کے بارے میں معلوم کیا۔ ڈاکٹر ابھی تک
کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور یہ خبر انتہائی پریشان کن تھی۔

"اب۔ اب کیا ہوگا ابا جان؟"

"فکر نہ کرو۔ تم سو جاؤ۔ [illegible] بہتر کرنے والے ہیں۔"

"آپ نے کیا فرمایا، ہم سو جائیں؟"

"ہاں! اب جو کچھ بھی ہوگا، صبح ہوگا۔ صبح سویرے
تم لوگوں کو ہوائی اڈے پہنچنا ہے۔ وہاں آنکھیں کھلی رکھنی
ہیں۔ اور اس کے بعد تم ایوانِ صدر میں بھی موجود رہو گے،
وہاں مجرم بھی موجود ہوگا۔ خیال رہے۔ تمھیں مجرم کو پہچاننا
ہے۔" انھوں نے پُراسرار انداز میں کہا۔

"لیکن ابا جان۔ ہوائی اڈے پر جا کر ہم کیا کریں گے،
جب کہ وہاں ہمارے صدر صاحب ہی نہیں پہنچیں گے۔" محمود
نے حیران ہو کر کہا۔

"پہنچیں گے کیوں نہیں۔ ضرور پہنچیں گے۔"

"وہ۔ وہ کیسے؟"

"جیسے بھی ہو۔ انھیں وہاں پہنچنا ہوگا۔" وہ بولے

"نہ جانے آپ کا کیا پروگرام ہے؟" فرزانہ نے اُلجھن کے
عالم میں کہا۔
"ذہن کو اُلجھانے کی ضرورت نہیں، بس تم سو جاؤ۔"
"جی بہتر۔ آپ کہتے ہیں تو سو جاتے ہیں۔"
اُسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ انسپکٹر جمشید نے جلدی سے
ریسیور اُٹھایا۔ دُوسری طرف نائب صدر بول رہے تھے:
"جمشید۔ اب کیا بنے گا؟"
"فکر نہ کریں۔ ابھی صبح ہونے میں بہت دیر ہے۔
سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"لیکن کیسے۔ میں نے ابھی ابھی ہسپتال فون کیا تھا۔ ان
لوگوں کو ایک فی صد بھی کامیابی نہیں ہوئی۔"
"یہ بات بھی میرے ذہن میں ہے۔ اس کے باوجود میں کہہ
رہا ہوں۔ آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔"
"اچھی بات ہے جمشید۔ یہ خیال رہے۔ کہیں ملک کی ناک
نہ کٹ جائے۔"
"آپ فکر نہ کریں جناب عالی۔ میں اپنی ناک تو کٹوا سکتا
ہوں۔ اپنے بچوں کی ناکیں بھی کٹوا سکتا ہوں، ملک کی ناک
نہیں کٹوا سکتا۔"
"ہم۔ ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ اچھا۔ [illegible] ناک ہے۔" یہ کہہ

کر انھوں نے ریسیور رکھ دیا۔
اس کے بعد بھی کئی فون آئے اور وہ سب کو تسلی
دیتے رہے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی وہیں ٹک کر رہ
گئے تھے:
"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کی ساری رات تسلی
دیتے گزر جائے گی۔"
"اوہو۔ تم ابھی تک یہیں ہو۔ میں کہتا ہوں۔ جاؤ۔ جا
کر سو جاؤ۔ میں چاہتا ہوں۔ صبح تم بالکل تازہ دم ہو۔
بھرے مجمعے میں سے مجرم کو پہچاننا بہت مشکل کام ہے اور
یہ کام تمھیں کرنا ہے۔"
"جی بہتر۔" آخر وہ اُٹھ گئے۔
دُوسری صبح وہ بیدار ہوئے تو ان کے والد گھر میں
موجود نہیں تھے۔ بیگم جمشید نے انھیں بتایا کہ وہ تو رات
بارہ بجے ہی گھر سے چلے گئے تھے۔ دروازہ انھوں نے ہی
بند کیا تھا۔
"اس کا مطلب ہے۔ ہمیں ایئرپورٹ جانے کی تیاری
کر لی چاہیے۔" محمود بولا۔
"ہاں۔" فرزانہ نے کہا۔
وہ جلدی جلدی تیار ہوئے اور ناشتا کر کے ایئرپورٹ کی

طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں ان سے پہلے ہی ایک خلقت جمع ہو چکی تھی۔ صدرِ مملکت اور گوانا کے صدر کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ انھوں نے دُور دُور تک کا جائزہ لیا۔ ان کے والد کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے، مہمان صدر کے آنے میں ابھی پورے بیس منٹ باقی تھے اور ان سے پانچ منٹ پہلے میزبان صدر کو پہنچنا تھا۔

"کیا صدرِ مملکت یہاں پہنچ سکیں گے؟" فرزانہ بڑبڑائی۔

"ابّا جان نے کہا تھا کہ ضرور پہنچیں گے۔ اس صورت میں تو ہم بھی یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضرور پہنچیں گے۔" محمود نے کہا۔

"[illegible] کرے ایسا ہی ہو۔" فاروق بولا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد صدر صاحب کی آمد کے آثار نظر آنے لگے۔ پہلے ہراول فوجی پہنچے۔ راستا پہلے ہی صاف تھا۔ صدر صاحب کی کار جہاز اُترنے کی جگہ تک جاتی تھی۔ وہیں انھیں پانچ منٹ انتظار کرنا تھا۔ اور پھر جہاز سے مہمان صدر اُترتے، پھر دونوں صدر آپس میں بغل گیر ہوتے۔

آخر صدر صاحب کی کار نظر آنے لگی۔ انھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ اندر صدر صاحب بیٹھے مُسکرا رہے تھے۔

"لیکن۔ کیا یہ واقعی صدر صاحب ہیں؟" محمود ہکلایا۔

"نظر تو صدر صاحب ہی آ رہے ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"ابّا جان نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ سب کچھ ان پر چھوڑ دیا جائے۔" فاروق نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ لیکن یہ کس طرح ممکن ہو گیا؟"

"یہ تو [illegible] کو ہی معلوم ہے۔ یا پھر ابّا جان جانتے ہیں کہ یہ کس طرح ہو گیا۔"

اتنے میں کار ان کے سامنے سے گزر کر اندر جا چکی تھی۔ اب سب لوگ اس حصے کی طرف بڑھنے لگے جہاں سے مُلاقات کا منظر دیکھا جاتا تھا۔ آخر جہاز آ گیا، پھر وہ رن وے پر دوڑنے لگا۔ یہاں تک کہ رُک گیا، اس کا دروازہ کھل گیا اور مہمان صدر ہاتھ ہلاتے ہوئے سیڑھیاں اُترنے لگے۔ استقبال کے لیے آنے والے شہریوں نے پُرجوش انداز میں تالیاں بجانا شروع کیں۔ پھر وہ سیڑھی سے نیچے اُتر آئے۔ یہاں صدرِ مملکت ہار لیے کھڑے تھے۔ وہ انھوں نے مہمان صدر کے گلے میں ڈال دیا اور پھر دونوں صدر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ پھر مہمان کے ساتھ آنے والے وزرا سے انھوں نے ہاتھ ملایا۔ اب سب لوگ کاروں میں بیٹھ گئے اور یہ قافلہ وہاں سے روانہ ہوا۔

"آؤ بھئی۔ اب ہمیں بھی ایوان صدر کا رُخ کرنا ہے۔"

محمود نے کہا۔

وہ تیز تیز چلتے اپنی موٹر سائیکلوں تک آئے اور ایوانِ صدر کی طرف روانہ ہو گئے۔ لوگوں کا ایک لشکر ایوانِ صدر کا رُخ کر رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہوئے لوگ تالیاں بجا بجا کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے، مہمان صدر نے ہاتھ کار سے باہر نکال رکھا تھا اور وہ برابر ہاتھ ہلا کر ان کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔

اس طرح یہ قافلہ ایوانِ صدر تک پہنچا۔ لوگ دعوتی کارڈ دکھا دکھا کر اندر داخل ہونے لگے۔ ان کے پاس بھی کارڈ موجود تھے۔ لہٰذا اندر داخل ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اب وہ اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے:

"اب ہمارا کام شروع ہوتا ہے۔ بقول آغا جان۔ اس ہال میں مجرم بھی موجود ہے۔ اور ہمیں یہی دیکھنا ہے کہ وہ کون ہے؟" فرزانہ نے سرگوشی کی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم اپنا معائنہ شروع کر دیتے ہیں۔ پوری طرح نظر رکھو۔"

انھوں نے سب کا بغور جائزہ لینا شروع کیا۔ دونوں صدر ایک صوفے پر بیٹھ چکے تھے اور نہایت گرم جوشی سے باتیں کر رہے تھے۔ اچانک فرزانہ کی آنکھوں میں حیرت چمکی۔

"ادھر دیکھو محمود۔ فاروق۔ لفافہ۔"

"لفافہ۔ میں تمھیں لفافہ نظر آ رہا ہوں۔" فاروق نے جھلاتے ہوئے انداز میں سرگوشی کی۔

"نن۔ نہیں۔ وہ دیکھو۔ لفافہ۔"

اب انھوں نے اس سمت میں دیکھا۔ ایک لفافہ ایک ایک آدمی کے ہاتھ سے نکل آگے چلا آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ لفافہ ان تک پہنچ گیا۔ انھوں نے دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔ مہمان صدر کے لیے۔ ایک فوری اطلاع۔

ان کا جی چاہا۔ اس لفافے کے ٹکڑے کر دیں اور ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیں، لیکن سب کی نظریں اسی لفافے پر جمی تھیں۔ مجبوراً انھیں لفافہ آگے سرکا دینا پڑا۔ اب وہ بھی صرف لفافے کی طرف متوجہ تھے۔ حالاں کہ انھیں تو سب مہمانوں کو دیکھتے رہنا چاہیے تھا۔

اور پھر لفافہ مہمان صدر کے ہاتھ میں جا پہنچا۔ صدرِ مملکت کے چہرے پر بھی اس لفافے کے اوپر لکھے الفاظ پڑھ کر حیرت کے آثار دوڑ گئے۔

"معاف کیجیے گا۔ یہ میرے لیے ہے۔ کیا میں اسے کھول کر دیکھ لوں؟" مہمان صدر بولے۔

"جی ہاں، کیوں نہیں۔" صدرِ مملکت نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"شکریہ" مہمان صدر نے کہا اور لفافہ چاک کر کے اس میں سے کاغذ لیا۔ اس پر ایک مختصر سی تحریر لکھی تھی۔ مہمان صدر اس تحریر کو پڑھتے چلے گئے، پھر ان کی پیشانی پر پڑنے والے بل صاف نظر آنے لگے۔

"یہ۔ یہ کیا پڑھا ہے میں نے" ان کے منہ سے کھوئے کھوئے انداز میں نکلا۔

"کیا بات ہے۔ خیر تو ہے۔ لائیے میں دیکھوں کیا ہے اس میں" صدرِ مملکت بولے۔

"نہیں۔ آپ اسے پڑھ کر نہ دیکھیں۔ پہلے یہ بتائیں۔ آپ کون ہیں؟"

"کیا فرمایا آپ نے۔ میں کون ہوں"

"ہاں! آپ کون ہیں؟"

"میں اس ملک کا صدر ہوں۔ یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں"

"لیکن اس خط کے مطابق آپ صدرِ مملکت نہیں ہیں۔ میرے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے۔ یہ دیکھیے۔ آپ خود پڑھ لیجیے اور پڑھ کر جواب دیجیے۔ آپ کون ہیں۔ میرے میزبان کہاں ہیں؟"

ایوانِ صدر کے ہال میں موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔ لوگوں کے رنگ اڑ گئے؛ تاہم چند چہروں پر زبردست قسم کی

رونق بھی نظر آ رہی تھی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کی نظریں ان پر رونق چہروں پر جم گئیں۔ ان کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔

صدرِ مملکت نے وہ کاغذ ان سے لے کر پڑھا اور انھوں نے غصے میں آ کر کہا:

"یہ کسی نے بہت ہی بے ہودہ مذاق کیا ہے۔ اس پرچے کے مطابق میں اصلی صدر نہیں ہوں۔ اصلی صدر تو ملٹری ہسپتال میں پڑے ہیں اور ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں جناب۔ کیا یہ بات درست نہیں ہے"

"یہ بات بالکل غلط ہے" صدر صاحب بولے۔

"اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ اطلاع غلط نہیں ہے"

"اس کا ثبوت میں خود آپ کے سامنے موجود ہوں"

"صدرِ مملکت کے میک اپ میں کوئی بھی میرے پاس موجود ہو سکتا ہے" مہمان صدر بولے۔

"میک اپ کو چیک کیا جا سکتا ہے۔ اصلی چہرے اور نقلی چہرے میں فرق ہوتا ہے"

"لیکن ایسا صرف ماہرین کر سکتے ہیں"

"تو پھر ہم ماہرین کو بلا لیتے ہیں" صدرِ مملکت بولے۔

"کیا یہ دنیا کا عجیب ترین واقعہ نہیں ہو گا۔ کہ ایک

ملک کے صدر کا چہرہ ٹٹولا جائے گا۔" مہمان صدر بولے۔

"بے شک ہو گا، لیکن آپ کو مطمئن کرنے کا اس کے علاوہ اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔" صدرِ مملکت بولے۔

"یہ لفافہ کن صاحب نے دیا ہے؟" مہمان صدر نے گونج دار آواز میں کہا، لیکن ہال میں سے کسی نے جواب نہ دیا۔

"کوئی جواب نہیں دے گا۔ جو خود چور ہے، وہ کیا سامنے آ سکتا ہے۔" صدر صاحب نے بُرا سا منہ بنایا۔

"تب پھر۔ معاملہ کس طرح صاف ہو؟"

"اگر آپ اجازت دیں۔ تو میں اس معاملے کو صاف کیے دیتا ہوں۔" ایک صاحب نے اُٹھ کر کہا۔

"اس سے اچھی بات کیا ہو گی۔" مہمان صدر نے فوراً کہا۔

محمود، فاروق اور فرزانہ نے بے تابانہ انداز میں ہر طرف دیکھا، لیکن انھیں اپنے والد کہیں بھی نظر نہ آئے۔ انھوں نے سُنا۔ وہ صاحب کہہ رہے تھے:

"میں میک اپ کا ماہر ہوں جنابِ عالی۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ صدرِ مملکت میک اپ میں نہیں ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ ایسا دعویٰ تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ اس کا کوئی ثبوت بھی تو ہونا چاہیے۔"

"میں ثبوت بھی پیش کر سکتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے۔"

یہ کہہ کر ان صاحب نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیے۔ آدھ منٹ بعد ان کے چہرے سے ایک جھلی سی اُتری چلی گئی۔ دُوسرے ہی لمحے تمام حاضرین اچھل پڑے۔ کیوں کہ ان کے سامنے ایک اور صدرِ مملکت موجود تھے۔ اب تو مارے حیرت کے سب کا بُرا حال ہو گیا۔ مہمان صدر کا حال سب سے بُرا تھا:

"یہ۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ تو کیا اصل صدر آپ ہیں؟" انھوں نے کھڑے ہوئے صاحب سے کہا۔

"جی نہیں۔ اصل صدر آپ کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ ہمارے سازشی مہربان کا خیال یہ تھا کہ چوں کہ صدر صاحب کی دماغی حالت درست نہیں ہے۔ اس لیے ان کی جگہ میں لوں گا، لیکن ان کے سازشی دماغ کے اُلٹ صدرِ مملکت جلد سے پہلے ہی صحت یاب ہو گئے۔ ہمارے مہربان اسی خیال میں رہے کہ ان کی جگہ میں نے لے رکھی ہے۔ پروگرام بے شک یہی تھا۔ لیکن چوں کہ صدرِ مملکت بالکل ٹھیک ہو گئے۔ اس لیے اس کے پروگرام کے اُلٹ ایک دُوسرا پروگرام بن گیا۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سازشی دماغ کا سارا منصوبہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔"

"ضرور۔ ضرور۔ اس کے بغیر تو کام نہیں چلے گا۔" مہمان صدر نے

بھرپور دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"بہت بہتر جناب عالی۔ ہمارے سازشی مہربان کا تعلق
شارجستان سے ہے۔ شارجستان کی کوشش یہ ہے کہ آپ کے اور
ہمارے ملک کے آپس میں تعلقات قائم نہ ہونے پائیں۔ آپ
کے اس دورے کی خبر پہلے ہی اخبارات میں شائع کر دی
گئی تھی، شارجستان نے پروگرام بنایا کہ اس ملاقات کو درہم برہم کر
دیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے ہمارے ملک میں موجود اپنے
ایک جاسوس کو چنا۔ اسے یہ ساری ذمے داری سونپی۔ وہ بہت
چالاک آدمی ہے۔ اس نے پہلے سے ہر کام کی منصوبہ بندی
کی۔ اور پھر صدرِ مملکت کو ان کے پرائیویٹ بنگلے سے اغوا کر
لیا۔ اور انھیں ایک دوا کا انجکشن دے دیا، اس انجکشن نے
ان کی ذہنی صلاحیت سن کر دی۔ صدرِ مملکت کی طرف سے
ان کے گھر خیریت کی اطلاع نہ پہنچی تو یہ معاملہ میرے سپرد
ہوا۔ میں نے چھان بین شروع کی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے
جنابِ عالی۔ تفصیلات اخبارات میں شائع ہو ہی جائیں گی
قصہ مختصر یہ کہ میں اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا اور اس
وقت اصل صدرِ مملکت یہاں تشریف فرما ہیں۔ ہمارے سازشی
مہربان کا منصوبہ چوپٹ ہو چکا ہے۔ یہ کس طرح ہوا
اس کی تفصیل بہت دلچسپ ہے۔ اگر آپ سننا پسند کریں

عرض کروں؟

"ضرور ضرور۔ کیوں نہیں، لیکن پہلے یہ بتا دیں۔ آپ خود
دراصل کون ہیں؟"

"میں انسپکٹر جمشید ہوں جنابِ عالی؟"

"اوہ!" کئی آوازیں ابھریں۔

پھر انھوں نے مجرموں والے مکان تک پہنچنے کا واقعہ
سنا دیا اور آخر میں بولے:

"اس مکان سے ہمیں چار انجکشن بھی ملے تھے۔ ڈاکٹر
صاحب بھی ان کے بارے میں کچھ نہ جان سکے۔ آخر میں
نے ان میں سے ایک انجکشن اپنے دوست خان رحمان کے
لگوا دیا۔ وہ بھی مجرم کی اس دوا کا شکار ہو گئے تھے،
چند منٹ بعد وہ ٹھیک ہو گئے۔ دوسرا انجکشن میں نے اپنے
ت کو لگوایا۔ وہ بھی اصل حالت پر آ گئے۔ اب بہت
اطمینان ہو گیا تھا۔ اس لیے صدرِ مملکت کو بھی انجکشن لگا دیا
گیا۔ اور یہ بھی ٹھیک ہو گئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ان
کی جگہ یہ خادم ہی آپ سے ملاقات کرتا اور اس صورت
مجرم کا یہ رقعہ یہاں سنسنی پیدا کر دیتا اور میرے پیروں تلے
بھی زمین کھینچ لیتا، لیکن [illegible] کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ جس نے
وقت نہیں آنے دیا۔"

یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔ ایسے میں صدر صاحب کی آواز گونجی:

"لیکن جمشید۔ وہ سازشی مہربان آخر ہے کون؟"

"وہ۔ اسی محفل میں موجود ہے۔"

"کیا!!!"

بے شمار آوازیں ابھریں۔

وہ موجود ہے

یہاں پر [illegible] میرے سامنے [illegible] آؤ

"جی ہاں! وہ یہاں موجود ہے۔ اسے مجبوراً یہاں آنا پڑا، کیوں کہ یہ لفافہ تو اسی کو جیب سے نکال کر آگے کرنا تھا۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر بتائیے نا۔ وہ کون ہے؟" مہمان صدر بولے۔

"فرزانہ! یہ بات تم بتاؤ گی۔ وہ کون ہے۔ جس نے لفافہ آگے چلانا شروع کیا تھا۔"

"بائیں طرف نیلے لباس میں ملبوس بیٹھے ہوئے صاحب نے لفافہ اپنی جیب سے نکالا تھا۔" فرزانہ نے اسی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نیلے لباس والا اچھل پڑا اور چیخ کر بولا:

"یہ۔ یہ غلط ہے۔ الزام ہے۔"

فوراً ہی چار فوجی آگے بڑھے اور اسے جکڑ لیا:

"مسٹر۔ اگر یہ غلط ہوا تو ہم آپ سے معافی مانگ لیں گے۔

ذرا اپنے کاغذات دکھا دیں۔"

"ہم۔ میں محکمہ اطلاعات میں پبلسٹی آفیسر ہوں۔" اس نے
ہکلا کر کہا۔

"میں نے یہ نہیں پوچھا۔ یہ کہا ہے کہ اپنے کاغذات دکھا
دیں۔"

اس نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر ایک ملٹری مین کو دے
دیا۔ کارڈ انسپکٹر جمشید تک پہنچا دیا گیا۔ انھوں نے کارڈ پر ایک
نظر ڈالی اور بولے:

"تو آپ کا نام ماجد رئیس ہے۔"

"ہاں! لفافہ میں نے ہرگز جیب سے نہیں نکالا تھا۔"

"تب وہ آپ کو کس نے دیا تھا؟"

"ان صاحب نے۔" اس نے اپنے ساتھ والے کی طرف اشارہ
کیا۔

"یہ۔ یہ غلط ہے۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"یہ بالکل درست ہے۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہم۔ میں خالد شیرازی ہوں۔ محکمۂ خارجہ سے تعلق ہے میرا۔"

"تو آپ نے لفافہ مسٹر ماجد کو نہیں دیا؟"

"جی نہیں۔"

"گویا آپ کو کسی نے لفافہ دیا، نہ آپ نے آگے کسی کو
دیا۔"

"جی ہاں! یہی بات ہے۔"

"اس صورت میں یا تو آپ مجرم ہیں یا مسٹر ماجد۔" انسپکٹر
جمشید مسکرائے۔

"ہم۔ میں۔ بھلا میں مجرم کس طرح ہو سکتا ہوں۔"

"اس لیے کہ آپ قطار کے آخری آدمی ہیں۔ اگر لفافہ آپ
نے جیب سے نہیں نکالا تو پھر ضرور ماجد رئیس صاحب نے نکالا
ہے۔ اب فیصلہ یہ کرنا ہے کہ آپ میں سے کون مجرم ہے۔
صاحب صدر اور معزز مہمان! اگر آپ لوگ اس کارروائی سے بور
ہو رہے ہوں تو میں ان دونوں کو لے کر کسی اور کمرے میں چلا
جاؤں۔ بہرحال یہ طے ہے کہ مجرم ان میں سے ایک ہے۔"

"نہیں۔ ہم اس کارروائی کو سننا اور دیکھنا پسند کریں گے۔"
مہمان صدر بولے۔

"جی بہتر۔ میں نے تو یہ سوچ کر کہا تھا کہ آپ کے پاس وقت
کہیں کم نہ ہو۔"

"پروا نہیں۔" صدر مملکت بولے۔

"شکریہ جناب۔ جس مکان کا میں نے ذکر کیا۔ اس سے میں نے
رات کے وقت انگلیوں کے نشانات بھی اٹھوائے تھے۔ اس وقت

وہاں مجرم بھی موجود تھا۔ لہٰذا ان میں سے جن کی انگلیوں کے نشانات ان نشانات سے مل گئے۔ وہی مجرم ہے۔ کتنا آسان طریقہ ہے۔"

"ویری گڈ۔ یہ تو بہت ہی مزے کی بات ہے۔"

"نن۔ نہیں۔ نہیں۔" ماجد رئیس کے منہ سے خوف زدہ انداز میں نکلا۔

"تو مجرم آپ ہی ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے شوخ آواز میں کہا۔

اس کا چہرہ لٹک گیا۔ منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔

"فیصلہ خود بخود ہو گیا، نشانات چیک کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اب میں مجرم صاحب سے دو باتیں اور عرض کرنا پسند کروں گا۔"

"جی دو باتیں۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! دو باتیں۔ کیس کے آخر میں بعض اوقات یہ دو باتیں بہت مزا دیتی ہیں۔ تو سنیے۔ پہلی بات۔ جھیل والے بنگلے کا پتا ہمیں ایک دیہاتی نے بتایا تھا۔ وہ دیہاتی دراصل یہی ماجد رئیس صاحب تھے۔"

"ارے!" ان کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! یہ تو تھی ایک بات۔ اب سنیے دوسری بات۔ ابرار باچا نے خودکشی نہیں کی تھی۔ اس وقت کمرے میں ماجد رئیس عرف دیہاتی بھی موجود تھا۔ زہریلی سوئی اس نے ابرار باچا کے جسم میں پیوست کی تھی۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

"اب ایک تیسری مزے کی بات۔ چھاگی اور فیروزا کو موت کے گھاٹ اتارنے والا بھکاری بھی ماجد رئیس تھا۔"

"کیا!!!"

اس مرتبہ محمود، فاروق اور فرزانہ اپنی آوازیں بلند ہونے سے کسی طرح نہ روک سکے۔

"اور میرا خیال ہے۔ اب مجرم کو لے جایا جا سکتا ہے۔ اور یہاں کی کارروائی شروع کی جا سکتی ہے، کیوں کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے، صدر دربے چالاکی سے بنایا ہوا منصوبہ بھی ناکام ہو چکا ہے۔"

ملٹری مین اسے لے جانے لگے۔ اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔

"ایک منٹ ابا جان۔ آپ اپنی دو باتوں کی بجائے تین باتیں کر چکے، ایک بات پوچھنے کی ہمیں بھی اجازت مرحمت فرمائیں۔" فاروق نے بے تابانہ انداز میں کہا۔

"ضرور ضرور۔ کیوں نہیں۔" صدر مملکت نے خوش ہو کر

کہا۔

"اگر ماجد رئیس ہی وہ دیہاتی بھی تھا۔ تو پھر اس نے بنگلے سے لوٹتے وقت آپ کو یہ کیوں بتایا تھا کہ بنگلے میں ایک ایسے صاحب رہتے ہیں جو مہینے میں صرف تین دن گزارتے ہیں۔ وہیں سے تو آپ پھر بنگلے کی طرف گئے تھے اور تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھا پائے تھے۔ آخر اسے ایسا کرنے کی ضرورت کیوں تھی؟"

"اچھا سوال ہے۔ اور اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ یہ ہمارے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دینا چاہتا تھا کہ اس کا منصوبہ صرف اور صرف یہ ہے کہ دونوں صدر صاحبان کی ملاقات نہ ہو پائے تاکہ آخر میں میں یہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاؤں، یعنی صدر صاحب کے میک اپ میں ملاقات کرنے پر۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب میں اس کی سازش کے جال میں پوری طرح اُلجھ جاؤں۔"

"ہوں۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ اس کا مطلب ہے۔ جیکی بھی شارجستان کا ایجنٹ تھا؟"

"ہاں! اس منصوبے کے لیے آدمی ماجد رئیس نے جیکی سے حاصل کیے تھے۔"

"بہت بہت شکریہ ابا جان۔ اب معاملہ پوری طرح صاف ہو

گیا ہے۔ لہٰذا آزادانہ پروگرام پر عمل شروع کیا جا سکتا ہے۔ اور مہربانی فرما کر ابا جان۔ آپ یہ میک اپ اتار دیں۔ ورنہ عجیب سی اُلجھن ہوتی رہے گی۔ اور اگر کچھ دیر سے آنے والے لوگ پہنچ گئے تو اور بھی مشکل پیدا ہو جائے گی۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

اور ہال میں مسکراہٹیں تیرنے لگیں ۔۔۔

سازشی مہربان

کا انعامی سوال

ص: آپ نے مجرم کو کون سے صفحے پر پہچانا؟

*

- ۔/۲۵۰ روپے کا انعام درست جوابات پر بذریعہ قرعہ اندازی پانچ قارئین میں تقسیم کیا جائے گا۔
- اپنا جواب بالکل الگ کاغذ پر لکھیں۔
- کاغذ کاپی سائز استعمال کریں۔
- اس کاغذ پر نام اور پتا ضرور لکھیں۔
- جوابات ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک وصول کیے جاتے ہیں۔

(ادارہ)

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۴۲

خاموش ہتھیار

مصنف: اشتیاق احمد

- ان کے ملاقاتی کا مہمان گم ہو گیا تھا۔
- ابھی وہ گیا ہی تھا کہ دوسرا ملاقاتی آ دھمکا۔
- لیکن تیسرا ملاقاتی ان سے بالکل مختلف ثابت ہوا۔
- ایک شخص جنوبی پہاڑیوں میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔
- وہ کس پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔
- انسپکٹر جمشید کی اپنے ایک پرانے دوست سے عجیب ترین ملاقات۔

قیمت: چھ روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۴۳

آج کی لاش

مصنف: اشتیاق احمد

- ان دنوں شہر میں ہل چل مچی تھی۔
- ہر رات کو ایک لاش ملتی تھی۔
- پورے شہر کی پولیس گشت پر تھی۔
- اکرام اور محمد حسین آزاد نے ایک لرزہ خیز چیخ سنی۔
- انسپکٹر جمشید اس مرتبہ پھر ایک بہت بڑے مجرم سے ٹکراتے ہیں۔
- ان پر کیا گزری۔
- مدتوں یاد رہنے والا ایک ناول۔

قیمت: چھے روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک

آفتاب، آصف، فرحت اور انسپکٹر کامران مرزا سیریز ۵۴

فرضی تھانہ

مصنف: اشتیاق احمد

- ان کی کار روک لی گئی۔ کاغذات طلب کیے گئے۔
- کاغذات مکمل تھے، لیکن اس کے باوجود انھیں تھانے لے جایا گیا۔
- تھانے میں ہی نہیں۔ حوالات میں بند کرنے کی کوشش کی گئی۔
- اور پھر انسپکٹر کامران مرزا کو مجبوراً اپنا تعارف کرانا پڑا۔
- انھیں ان کے دوست نے بلایا تھا۔
- دوست کی بات سن کر انسپکٹر کامران مرزا چونک اٹھے۔
- آفتاب، آصف اور فرحت میدان عمل میں۔

قیمت: چھے روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک

شوکی سیریز ۳۵

زخمی بُت

مصنف : اشتیاق احمد

- لیجیے ۔ بُت بھی زخمی ہونے لگے ۔
- لیکن کیسے ۔ یہ تو آپ زخمی بُت پڑھ کر ہی جان سکیں گے ۔
- شوکی برادرز کے لیے نئی اُلجھنیں ۔
- ایک خوف ناک آدمی ان کی تاک میں تھا ۔
- انھوں نے اس کا مقابلہ کس انداز سے کیا ، پڑھیے اور مسکرائیے ۔

قیمت : ۶ روپے

برکس وے

مصنف : آفتاب احمد

- انھیں ایک سنسنی خیز پیغام ملا ۔
- سمندر میں ایک خوف ناک ہنگامہ ۔
- سمندر کے ذریعے کس چیز کی تجارت ہو رہی تھی ۔
- آپ آخر تک نہ جان سکیں گے ، حیرت ہر لمحے بڑھتی چلی جائے گی ۔
- اور آخر میں جب راز کھلے گا تو اُچھل پڑیں گے ۔
- آفتاب احمد کا قلم اب روز بروز نکھر رہا ہے ۔ یہ ناول پڑھ کر آپ یہی محسوس کریں گے ۔

قیمت : ۶ روپے